ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! حج کا عظیم اجتماع اس بار سانحات کا شکار رہا۔ بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ اپنے پیاروں کو منتظر چھوڑ کر کتنے ہی حاجی ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ لبیک کی صدائیں لگانے والے حالتِ احرام میں رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ عید کا مبارک دن ان کے لیے رب کی طرف پلٹنے کا موقع بن گیا۔ کرین حادثے میں جان سے جانے والوں کی خوش نصیبی کا تو کیا کہنا کہ وہ مطاف میں تھے اور وہی وقت ان کا دم واپسیں بن گیا، جبکہ بھگدڑ کا سانحہ تب پیش آیا جب حجاج اپنا حج مکمل کر کے یوں صاف ستھرے ہو گئے تھے جیسے نیا جنم لیا ہو، اور اسی معصومیت کی حالت میں وہ اپنے رب کو سونپے گئے۔ حرم کے نواحی قبرستان ان کو نصیب ہوئے، اور حرم میں کی گئیں مغفرت کی دعائیں ان کے حصے میں آئیں۔ اللہ ان کے حج قبول کرے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے، امین۔

جانے والوں کی خوش نصیبی اپنی جگہ، مگر حج کے موقع پر ہونے والے حادثات سنجیدہ غور و خوض کا تقاضا کرتے ہیں۔ بھگدڑ کا واقعہ گزشتہ سالوں میں کئی بار ہوا ہے اور ہر بار شہید ہونے والوں کی تعداد سینکڑوں میں رہی ہے۔ ہر ایسے واقعے کے بعد انتظامات بہتر کر دیے جاتے ہیں مگر ساتھ ہی حجاج کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اس بار پہلا حادثہ ان دیو قامت کرینوں کے گرنے سے پیش آیا جو حرم کی توسیع کے حالیہ منصوبے کی وجہ سے وہاں موجود تھیں۔ اتنی بڑی تعداد میں حجاج کی آمد کے باوجود ان کو وہاں سے نہیں ہٹایا گیا جب کہ ایسے موقع پر اتنی بھاری مشینری کا وہاں موجود رہنا کسی طور بھی خطرے سے خالی نہ تھا اور کسی بھی نوعیت کے حادثے کا سبب بن سکتا تھا۔ توسیع کا یہ منصوبہ بھی غیر معمولی ہے جو کہ مکہ شہر کے کثیر حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اس توسیع کے دوران سکیورٹی انتظامات مزید توجہ کے مستحق ہیں۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان جموں و کشمیر کی ورکنگ باؤنڈری پر بھارتی فوج کی جارحیت اور بلا اشتعال فائرنگ سے ہمارے کئی شہریوں کی شہادت ہوئی ہے۔ اب بھارت نے اس ورکنگ باؤنڈری پر دیوار تعمیر کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جو کہ یو این قراردادوں کی موجودگی میں بین الاقوامی قوانین کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ پاکستان نے جنرل اسمبلی کے اجلاس میں بھارت کے اس اقدام کے خلاف احتجاج ریکارڈ کروایا، پاکستان کی سفیر ملیحہ لودھی نے بھارتی جارحیت کے خلاف سلامتی کونسل کو خط لکھا، اس سے قبل جنرل راحیل شریف نے مسئلہ کشمیر کو یو این کی قراردادوں کے مطابق حل کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ ہماری فوجی اور سیاسی قیادت اس مسئلے پر یکسو ہے۔ سفارتی، فوجی اور سیاسی تینوں پہلوؤں سے اور عالمی و علاقائی دونوں سطحوں پر مربوط اور سنجیدہ کوششیں کی جائیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ اہلِ کشمیر اپنا حق پا سکیں۔

اس بار بتول کے گھر داری کے کالموں پر بات ہو جائے۔ اگرچہ ہمارے قارئین اور لکھاریوں میں مرد حضرات بھی شامل ہیں مگر بنیادی طور پر خواتین کا رسالہ ہونے کے ناطے یہ ایسے کالموں کے بغیر ادھورا سا لگتا ہے۔ ماضی میں گھر داری کے کئی دلچسپ سلسلے بتول کا حصہ رہے ہیں۔ لاہور سے نوشین ناز اور ملتان سے شگفتہ بھٹی یہ کالم تیار کیا کرتی تھیں۔ اب کچھ عرصے سے یہ سلسلہ تعطل کا شکار ہے۔ بتول پڑھنے والوں کی توجہ میں اس طرف مبذول کروانا چاہوں گی، خصوصاً جو نوجوان طالبات یہ رسالہ پڑھتی ہیں، یا ایسی خواتین جن پر گھر کی ذمہ داری بہت زیادہ نہیں ہے اور وہ وقت نکال سکتی

رکھنا چاہیئے کہ اس کے کاموں میں کسی بھی طرح کی معاونت خیر اور بھلائی کے کاموں میں معاونت ہے اور اجرِ کثیر کی ضامن۔ یہی سوچ ہے جس کے تحت بتول کے ساتھ وابستہ تمام لوگ رضا کارانہ بنیادوں پر حتی المقدور اس کام میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ بتول کا آغاز جس حسنِ نیت اور جن صالح جذبوں کے تحت ہوا تھا، وہی اس کے آج تک جاری رہنے کا باعث ہیں اور یہ پاکستان کا واحد ماہنامہ ہے جو اپنے اجرا سے لے کر آج تک بلا تعطل جاری ہے جب کہ اس کے اجرا کو ساٹھ برس ہونے کو ہیں۔ اور شاید بہت سے قارئین کے لیے یہ بات بھی ایک خبر ہوگی کہ بتول میں سب لکھنے والے بلا معاوضہ لکھتے ہیں جبکہ اور جنل اور معیاری تحریر حاصل کرنا آج کل ہر ادبی رسالے کے لیے چیلنج بنا ہوا ہے، اور ڈائجسٹ ادب تو چلتا ہی معاوضوں کے بل پر ہے۔ آپ کا جو بھی تحریری تعاون اس رسالے کو تقویت دے گا، اسے دلچسپ بنائے گا وہ اس کارِ خیر میں شامل رہے گا۔ گھر داری کے اس کالم میں کھانوں کی درست اور اچھی ترکیبیں، گھریلو سجاوٹ اور انتظامی معاملات چلانے کے طریقے یعنی ہوم مینیجمنٹ کے ٹپس، تجربے سے سیکھی ہوئی باتیں، کم وقت میں زیادہ کام نبٹانے کے گر، افزائشِ حسن کے نسخے، غذائیت پر رہنمائی، ڈائیٹ پلان، نوزائیدہ بچوں کی دیکھ بھال، یہ سب موضوعات شامل ہو سکتے ہیں۔ ترکیبیں آزمودہ ہونی چاہیئں، اور معلومات بے شک دیگر ماخذوں سے اکٹھی کی گئی ہوں مگر ان کا حوالہ آخر میں موجود ہو اور کالم کی ترتیب اپنی دی ہوئی ہو یعنی خاص بتول کے لیے۔ آپ اپنے اردگرد کسی ایسی خاتون کو بھی یہ کالم لکھنے کے لیے آمادہ کر سکتے ہیں جو اس میدان میں معلومات اور تجربہ رکھتی ہو۔ امید ہے ہمارے قارئین اس جانب ضرور توجہ دیں گے اور ہم جلد یہ سلسلہ دوبارہ شروع کر سکیں گے۔ پروین شاکر کے ان اشعار کے ساتھ اجازت کی طلب گار ہوں۔

پھیلا دیے خود ہاتھ طلب گار کے آگے
دیکھا نہیں کچھ ہم نے خریدار کے آگے
پھر شام ہوئی اور بڑھا ناخنِ امید
پھر صبح ہے اور ہم اسی دیوار کے آگے
کیا جاں کے خسارے کی تمنا ہو کہ اب عشق
بڑھتا ہی نہیں درہم و دینار کے آگے
انکار کی لذت میں جو سرشار رہے ہیں
کب ٹوٹ سکے ہیں رَسَن و دار کے آگے
گھمسان کا رن جیت کے لب بستہ کھڑی ہوں
میں پُشت سے آئے ہوئے اک وار کے آگے

دعا گو

صائمہ اسما

اللہ کی بنائی ہوئی تقدیر

رہے حیوانات تو ان کی انواع اور اقسام کے اعتبار سے ان کے دفاعی نظام اور ہتھیار مختلف ہیں اور ان کو حسب ضرورت قوت دی گئی ہے۔

چیتوں، شیروں، درندوں اور دوسرے پھاڑ کھانے والے جانوروں کو ایسے منہ دیئے گئے ہیں جو شکار کو پکڑ سکتے ہیں۔ تمام ایسے جانور جن کا گزارہ دوسرے جانوروں کے شکار پر ہے، ان کو اس مقصد کے لیے ناخن، تیز دانت اور مضبوط جبڑے دیئے گئے ہیں اور حملہ کرنے میں چونکہ وہ اعصاب اور عضلات سے کام لیتے ہیں لہٰذا ان کے پاؤں کے عضلات بہت سخت ہوتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں کے ناخن بہت سخت اور مضبوط ہوتے ہیں اور ان کے معدے کے اندر اس قسم کی تیزابی لعاب ہوتے ہیں جو گوشت اور ہڈیوں کو مختصر وقت میں ہضم کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح چرندوں اور پالتو جانوروں کے نظام ہاضمہ کو اس کی خوراک کے مطابق بنایا گیا ہے مثلاً وہ حیوانات جو چر کر گزارہ کرتے ہیں ان کا نظام ہضم بالکل مختلف ہے۔ ان کے منہ نسبتاً کھلے ہیں اور یہ جانور قوی اور مضبوط ناخن نہیں رکھتے۔ اسی طرح ان کے پھاڑ کھانے والے قوی دانت بھی نہیں ہوتے۔ اس کے مقابلے میں ان کے دانت ایسے ہیں جو گھاس کو کاٹنے والے اور پیسنے والے ہیں۔ یہ گھاس اور نباتات کو بڑی سرعت سے کھاتے ہیں اور جلد ہی اسے نگل لیتے ہیں۔ یوں وہ انسان کے لیے وہ خدمات سرانجام دیتے ہیں جن کے لیے ان کو پیدا کیا گیا ہے۔ دست قدرت نے ایک عجیب نظام ہضم دیا ہے جو گھاس کھاتے ہیں وہ اوجھ میں جمع ہوتا ہے۔ جب اس حیوان کا یومیہ کام ختم ہوتا ہے اور یہ آرام کرتا ہے تو اس کا تمام کھانا ایک خالی جگہ چلا جاتا ہے جسے ''ٹوپی'' کہا جاتا ہے۔ یہاں سے یہ دوبارہ منہ میں جاتا ہے۔ اب اسے دوبارہ خوب چبایا اور پیسا جاتا ہے اور تیسرے درجے میں جاتا ہے جسے امر تلافیف کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چوتھے درجے میں جسے رنفجہ کہا جاتا ہے۔ یہ طویل نظام ہضم صرف حیوان کے لئے بنایا گیا ہے کیونکہ جس قدر چرنے والے اور جگالی والے حیوانات ہیں ان کا شکار کیا جاتا ہے، لہٰذا ان کو ضرورت ہوتی ہے کہ وہ جلدی سے خوراک سٹور کر لیں اور پھر آرام سے جا کر ہضم کریں۔ جدید علوم نے اس بات کو دریافت کیا ہے کہ جگالی کا عمل ان حیوانات کی زندگی کے لیے ضروری ہے کیونکہ وہ گھاس جلدی ہضم نہیں ہوتی، اس لیے کہ نباتات کے تمام خلیوں پر سلیلوز کا پردہ ہوتا ہے اور ان کو ہضم کرنے کے لیے بہت ہی طویل وقت درکار ہوتا ہے۔ اگر جگالی کا نظام نہ ہوا اور ان کے معدے میں ایک خاص سٹور نہ ہو تو ان کو چراگاہ میں طویل وقت گزارنا پڑے۔ ممکن ہے کہ ان کو پورا دن گھاس کے ہضم کرنے میں لگ جائے اور پھر بھی وہ خوراک پوری نہ کر سکتے اور پورا دن خوراک کھانے اور چبانے ہی میں لگے رہتے۔ جلدی سے گھاس کھاتے ہیں اور پھر اس کو سٹور کر لیتے ہیں اور پھر جگالی کرتے ہیں جبکہ سٹور میں وہ کافی نرم ہو چکا ہوتا ہے تو اس طرح حیوانات کے کئی مقاصد پورے ہو جاتے ہیں۔ وہ اچھا کام بھی کر سکتے ہیں اور ان کی غذا بھی پوری طرح ہضم ہو جاتی ہے۔ یہ ہیں باری تعالیٰ کی تدابیر۔

وہ پرندے جو گوشت کھاتے ہیں مثلاً الو، شکرا، ان کی چونچ کمان کی طرح ہوتی ہے اور تیز ہوتی ہے اور گوشت نوچنے کی صلاحیت رکھتی ہے جبکہ آبی جانور مثلاً بطخ اور مرغابی کو چوڑی چونچ دی گئی ہے تاکہ وہ پانی اور کیچڑ میں اپنی خوراک تلاش کریں اور ان کی چونچ میں ایسے چھوٹے

چھوٹے ابھار ہوتے ہیں جو دانت کی طرح ہوتے ہیں اور کیڑوں وغیرہ کے کاٹنے میں مدد دیتے ہیں۔ ایسے ہی مرغیاں، کبوتر اور باقی پرندے جو زمین سے دانے اٹھا کر کھاتے ہیں، اس لیے ان کو چھوٹی چونچ اور باریک سر دیئے گئے ہیں۔ وہ چھوٹے سے چھوٹا دانہ بھی اٹھا لیتے ہیں جبکہ بگلے کی چونچ طویل ہوتی ہے اور اس کے نیچے ایک تھیلا ہوتا ہے جو جراب کی طرح ہوتا ہے۔ یہ شکاری کے جال کا کام کرتا ہے کیونکہ اس کی خوراک ہی مچھلی ہوتی ہے۔

ہد ہد اور ریوفردان کی چونچ تیز اور لمبی ہوتی ہے اور یہ کیڑے مکوڑے کھانے اور تلاش کرنے کے لیے موزوں ہوتی ہے کیونکہ یہ چیزیں زمین کے نیچے ہوتی ہیں۔ سائنس نے معلوم کر لیا ہے کہ کسی پرندے کی چونچ پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس کی خوراک کیا ہے۔

یہ بیان اب طویل ہوتا جا رہا ہے۔ ہم فی ظلال القرآن کے اختیار کردہ منہاج دائرہ سے نکل رہے ہیں۔ اگر ہم تمام انواع واقسام کے جانوروں اور مویشیوں پر کلام کریں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ صرف ایک چیز کو لے لیں ''امیبا'' جس کا ایک ہی خلیہ ہوتا ہے، ذرا ملاحظہ کیجئے کہ دست قدرت نے اس کی ضروریات کو کس طرح پورا کیا ہے اور اس کے لیے بھی ضروریات کا پورا پورا انتظام کر دیا ہے۔ امیبا ایک نہایت ہی باریک جسم والا حیوان ہے۔ یہ حوضوں، نالیوں اور پانی کی تہہ میں بیٹھے ہوئے پتھروں میں ہوتا ہے۔ یہ آنکھوں سے نہیں دیکھتا ہے۔ یہ ایک ڈھیلا ڈھالا جاندار ہے۔ حالات اور ضروریات کے مطابق یہ شکل بدل دیتا ہے۔ جب یہ حرکت کرتا ہے تو یہ اپنے جسم کے بعض حصے مطلوب مقام تک پہنچنے کے لیے آگے بڑھاتا ہے۔ یہ زائد حصے چھوٹے پاؤں کہلاتے ہیں۔ اگر اسے کوئی غذا ملے تو وہ ان چھوٹے ایک یا دو پاؤں سے پکڑ لیتا ہے۔ اس پر یہ ہضم کرنے والا ایک سیال پھینکتا ہے اور اس کے بعد حسب ضرورت کھا لیتا ہے، باقی کو دور پھینک دیتا ہے۔ یہ پانی سے آکسیجن لینے کے لیے پورے جسم کے ساتھ سانس لیتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ ایک ایسا حیوان جو سرے سے دیکھتا ہی نہیں، وہ زندہ رہتا ہے، حرکت کرتا ہے، غذا حاصل کرتا ہے، سانس لیتا ہے، اپنے فضلات نکالتا ہے اور جب وہ جوان ہوتا ہے تو دو حصوں میں بٹ جاتا ہے اور اس سے دو مختلف قسم کے حیوان بن جاتے ہیں بالکل جدید۔

نباتات میں بھی زندگی محیر العقول ہے۔ انسان اور حیوان اور پرندے کے عجائبات سے وہ بھی کسی طرح کم نہیں ہیں اور دست قدرت کی کارستانی ان حیوانات کے مقابلے میں نباتات کے اندر کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ یہ ہے مفہوم اس آیت کا۔

(وَخَلَقَ كُلَّ شَيۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا) ''اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور نہایت پورے پورے اندازہ سے پیدا کیا۔''

یہ کہ اللہ نے ہر چیز کو ایک مقدر کے مطابق پیدا کیا ہے۔ یہ ایک بہت ہی عظیم اصول ہے۔ یہ بہت ہی ہمہ گیر ہے مثلاً اس کائنات کی حرکت، اس کے واقعات، حادثات خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، وہ اللہ کی تقدیر اور تدبیر کے مطابق چلتے ہیں۔ انسانی تاریخ کی ہر حرکت، نفس انسانی کی حرکت، سانس لینا اور خارج کرنا مقدر ہے۔ ہر نفس کا وقت، مقام اور ماحول مقرر و مقدر ہے اور اس کی زندگی کائنات کی حرکت کے ساتھ مربوط ہے اور اسی طرح حساب و کتاب کے اندر ہے جس طرح بڑے بڑے واقعات دائرہ حساب میں ہوتے ہیں۔

دور ایک صحرا میں ایک اکیلا درخت کھڑا ہے۔ یہ تقدیر نے کھڑا کیا ہے اور اس کی کوئی ضرورت ہوگی۔ یہ درخت بھی کوئی فریضہ منصبی ادا کر رہا ہوگا، اور یہ بھی اس پوری کائنات کے نظام کے ساتھ مربوط ہے۔ یہ چیونٹی جو زمین پر چل رہی ہے اور یہ ذرہ جو ہوا میں اڑ رہا ہے اور یہ خلیہ جو پانی میں تیر رہا ہے، یہ بھی انہی اجرامِ فلکی کی طرح مقدر ہے اور کسی کے حکم سے اڑ رہا ہے۔ اللہ کی تقدیر زمان میں بھی چلتی ہے، مکان میں بھی چلتی ہے، مقدار بھی مقدر ہے، صورت بھی مقدر ہے اور تمام حالات اور

تمام اصول مقدر ہیں۔

اللہ کا نظامِ قضاوقدر کس طرح کام کرتا ہے، دیکھیں کہ مثلاً حضرت یعقوبؑ ایک دوسری عورت سے نکاح کرتے ہیں اوران سے یوسفؑ اور بن یامین پیدا ہوتے ہیں۔ کسی نے اس کے بارے میں خیال کیا کہ یہ بظاہر ایک شخصی فیصلہ تھا لیکن اس کے پیچھے دست قدرت کام کر رہا تھا تا کہ برادرانِ یوسف ان کے ساتھ حسد کریں، ان کو اندھے کنویں میں ڈال دیں۔ وہاں سے ان کو قافلہ پکڑ لے۔ مصر میں فروخت کر دے، مصر میں عزیزِ مصر کا گھر ہے۔ اس کی بیوی انہیں ورغلانے کی کوشش کرے۔ آپ بلند اور برتر ثابت ہوں۔ جیل میں بھیج دیئے جائیں، یہ کیوں؟ تا کہ جیل میں شاہی ملازمین سے ملیں، ان کے سامنے خواب کی تعبیر بیان کریں، یہ کیوں؟ ابھی تک تو ان واقعات کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ سوال اُٹھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ حضرت یوسفؑ تو بے گناہ جیل میں عذاب جھیل رہے ہیں پھر یعقوب علیہ السلام کا کیا قصور ہے، وہ کیوں جل رہے ہیں؟ وہ رنج والم سے کیوں بینائی کھو بیٹھے ہیں اور یوسف علیہ السلام کو یہ تکالیف کیوں دی جا رہی ہیں۔ جسمانی اور روحانی تکالیف، پورے پچیس سال گزرنے کے بعد پہلا جواب آتا ہے کہ تقدیر اسے مصر کی حکومت کے لیے تیار کر رہی تھی تا کہ مصر اوراس کے ملحقہ ممالک کو قحط سے بچایا جا سکے، پھر کس لیے؟ اس لیے کہ وہ اپنے والدین اور بھائیوں کو مصر بلالائیں، پھر اس لیے کہ ان کی نسل سے قوم بنی اسرائیل پروان چڑھے تا کہ فرعون ان پر مظالم ڈھائے اوران کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا جائے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اس کرۂ ارض پر وہ واقعات رونما ہوں، جو حضرت یوسفؑ کے کنویں میں ڈالنے کے بعد رونما ہوئے۔ ان واقعات کے اثرات اس دنیا میں آج بھی موجود ہیں اور دنیا کے واقعات پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

پھر ایک دوسرا واقعہ، یعقوب علیہ السلام کے دادا ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ مصر جاتے ہیں۔ مصری عورت ہاجرہ سے نکاح کرتے ہیں۔ یہ بھی کوئی انفرادی مسئلہ نہ تھا۔ یہ اوراس سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں جو واقعات رونما ہوئے جن کے نتیجے میں انہوں نے وطن چھوڑا، عرق سے کنعان، وہاں سے مصر، وہاں سے ہاجرہ کا لانا، اسماعیل علیہ السلام کا پیدا ہونا، ان کو بیت اللہ میں آباد کرنا تا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوں، ابراہیمؑ کی نسل سے، اس جزیرۂ عرب میں جو اس کرۂ ارض پر بہترین مکان ہے اور دعوت اسلامی کا مرکز ہے تا کہ اس کے نتیجے میں تاریخ انسانیت میں ایک عظیم حادثہ رونما ہو۔

یہ بھی اللہ کی تقدیر ہے اور اس کا پچھلا سرا دست قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ ہر حادثہ ہر واقعہ وہاں سے ہی نمودار ہوتا ہے۔ آغاز بھی وہاں سے، انجام بھی وہاں، ہر قدم، ہر تغیر میں دست قدرت کا ہاتھ ہے...... یہ اللہ کی تقدیر کا نظام ہے، یہ نافذ ہے، جامع وشامل ہے، باریک اور گہری۔

انسان اسی کے بالکل قریبی سرے کو دیکھ رہا ہے لیکن اسے اسباب کی دراز رسی کا دوسرا سرا نظر نہیں آتا اور بعض اوقات یہ رسی بہت دراز ہو جاتی ہے۔ زمانے گزر جاتے ہیں، دور دراز تک ہم نکل جاتے ہیں، ہمیں تقدیر وتدبیر کا سلسلہ نظر نہیں آتا۔ ہمیں سمجھ نہیں آتا کہ

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

کس طرح ہوگا؟ اس پر لوگ جلدی مچاتے ہیں، شور کرتے ہیں، نئی نئی تجاویز لاتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رہے ہیں۔ نظام قضاوقدر پر دست درازی کرتے ہیں۔

اللہ صاف صاف فرماتا ہے کہ اس نے ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کر رکھا ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ نتائج اس پر چھوڑ دیں جو نتائج کا مالک ہے اور آرام سے کام کریں۔ وہ اللہ کے نظامِ قضاوقدر سے ہم آہنگ ہو کر چلیں۔ نہایت انس ومحبت سے اپنے حصے کا کام کریں اور نہایت ثابت قدمی اور اللہ پر بھروسے کے ساتھ قدم بڑھاتے چلے جائیں۔

جہاں تک اللہ کے انقلاب کا تعلق ہے تو وہ پلک جھپکتے ہی نمودار ہوسکتا ہے۔ اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔☆

توبہ واستغفار کے آداب

میری صاف صاف بات سن کر نبیﷺ نے فرمایا اچھا جاؤ اور انتظار کرو کہ خدا تمہارے معاملہ میں کوئی فیصلہ فرمائے۔ میں اٹھا اور اپنے قبیلے کے لوگوں میں آبیٹھا۔ قبیلے کے لوگوں نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کیا کہ تم نے کوئی بات کیوں نہ بنادی تم تو ہمیشہ دین کے کاموں میں پیش پیش رہے ہو، لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میرے دو اور ساتھیوں نے بھی اسی طرح کی سچی بات کہی ہے تو میرا دل مطمئن ہوگیا اور میں نے طے کرلیا کہ میں اپنی سچائی پر جما رہوں گا۔ اس کے بعد نبیﷺ نے عام اعلان فرمایا کہ ہم تینوں سے کوئی بات نہ کرے۔ یہ اعلان ہوتے ہی میرے لئے مدینے کی زمین بالکل بدل گئی اور میں اپنوں میں بے یارومددگار بالکل اجنبی بن کر رہ گیا۔ کوئی بھی معاشرے میں مجھ سے سلام کلام نہ کرتا۔ ایک دن جب میں بہت زیادہ اکتا گیا اور طبیعت بہت گھبرائی تو اپنے ایک بچپن کے دوست اور چچازاد بھائی ابوقتادہؓ کے پاس گیا۔ میں نے جا کر سلام کیا لیکن اس خدا کے بندے نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے پوچھا، ابوقتادہؓ! میں تمہیں خدا اور اس کے رسولﷺ سے محبت نہیں ہے؟ وہ خاموش رہے میں نے پھر پوچھا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں، تیسری بار جب میں نے قسم دے کر پوچھا تو بس انہوں نے اتنا کہا: ''خدا اور خدا کے رسولﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔'' میرا دل بھر آیا اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور میں اپنا غم لئے ہوئے واپس آ گیا۔

انہی دنوں بازار میں شام کے ایک تاجر نے مجھے ''شاہ غسان'' کا ایک خط دیا۔ عیسائیوں کے اس بادشاہ نے لکھا تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ تمہارے صاحب تم پر بہت ہی ستم توڑ رہے ہیں، تم کوئی ذلیل آدمی تو ہو نہیں۔ تمہاری قدر ہم جانتے ہیں تم ہمارے پاس آؤ۔ ہم تمہارے مرتبے کے لائق سلوک کریں گے۔ خط دیکھتے ہی میری زبان سے نکلا، یہ ایک اور مصیبت نازل ہوئی اور اسی وقت اس خط کو میں نے چولھے میں جھونک دیا۔ چالیس دن اس حالت پر گزر چکے تھے کہ نبیﷺ کا فرستادہ نبیﷺ کا یہ حکم لے کر آیا کہ اپنی بیوی سے بھی علیحدہ ہو جاؤ۔ میں نے پوچھا طلاق دے دوں؟ جواب ملا نہیں، بس الگ رہو اور میں نے اپنی بیوی کو میکے روانہ کردیا اور اس خدا کی بندی سے کہہ دیا کہ اب تم بھی خدا کے فیصلے کا انتظار کرتی رہو۔

پچاسویں دن میں فجر کی نماز کے بعد اپنی جان سے بیزار نہایت ہی مایوس اور غمزدہ اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک کسی نے پکار کر کہا: ''کعبؓ! مبارک ہو'' یہ سنتے ہی میں سمجھ گیا اور اپنے خدا کے حضور سجدے میں گر پڑا۔ پھر تو لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ فوج در فوج میرے پاس مبارک باد دینے کیلئے آنے لگے۔ میں اٹھا اور سیدھا نبیﷺ کے پاس مسجد میں پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نبیﷺ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا تو نبیﷺ نے فرمایا: ''کعبؓ! مبارک ہو یہ تمہاری زندگی کا سب سے بہترین دن ہے میں نے کہا حضورﷺ یہ معافی آپﷺ کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے! فرمایا خدا کی طرف سے اور سورۂ توبہ کی یہ آیتیں پڑھ کر سنائیں۔

5۔ توبہ کرنے میں کبھی تاخیر نہ کیجیے زندگی کا حال کسی کو معلوم نہیں کب مہلت عمل ختم ہو جائے۔ کچھ خبر نہیں کہ اگلا لمحہ زندگی کا لمحہ ہے یا موت کا، ہروقت انجام کا دھیان رکھیے اور توبہ واستغفار کے ذریعے قلب وروح اور ذہن وزبان کو گناہوں سے دھوتے رہیے۔ نبیﷺ کا ارشاد

ہے!

''خدارات کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تا کہ جس شخص نے دن میں کوئی گناہ کیا ہے وہ رات میں خدا کی طرف پلٹ آئے اور دن میں وہ اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تا کہ رات میں اگر کسی نے کوئی گناہ کیا ہے تو وہ دن میں اپنے رب کی طرف پلٹے اور گناہوں کی معافی مانگے یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو۔'' (مسلم)

خدا کے ہاتھ پھیلانے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے گناہگار بندوں کو اپنی طرف بلاتا ہے اور اپنی رحمت سے ان کے گناہوں کو ڈھانپنا چاہتا ہے اگر بندے نے کسی وقتی جذبے سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر لیا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے رحیم وغفور خدا کی طرف دوڑے اور ذرا تاخیر نہ کرے کہ گناہ سے گناہ پیدا ہوتا ہے اور شیطان ہر وقت انسان کی گھات میں لگا ہوا ہے اور اس کو گمراہ کرنے کی فکر سے کسی وقت بھی بے فکر نہیں ہے۔

6۔ نہایت سچے دل سے خلوص کے ساتھ توبہ کیجئے جو آپ کی زندگی کی کایا پلٹ دے اور توبہ کے بعد آپ ایک دوسرے ہی انسان نظر آئیں۔

خدا کا فرمان ہے:

''اے مومنو! خدا کے آگے سچی اور خالص توبہ کرو۔ امید ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے گناہوں کو تم سے دور فرما دے گا اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اس دن خدا اپنے رسول ﷺ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لا کر اس کے ساتھ ہو لئے ہیں رسوا نہ کرے گا۔'' (التحریم:۸)

یعنی ایسی توبہ کیجئے کہ پھر قلب وذہن کے کسی گوشے میں بھی گناہ کی طرف پلٹنے کا کوئی شائبہ باقی نہ رہ جائے۔ ایسی توبہ کے تین یا چار اجزاء ہیں۔ اگر گناہ کا تعلق خدا کے حق سے ہے تو توبہ کے تین اجزاء ہیں:

(۱) انسان واقعی اپنے گناہوں کے احساس سے شرمسار ہو۔

(۲) آئندہ گناہ سے بچنے کا پختہ عزم رکھے۔

(۳) اور اپنی زندگی کو سنوارنے اور سدھارنے میں پورے انہماک اور فکر کیساتھ سرگرم ہو جائے۔ اور اگر اس نے کسی بندے کی حق تلفی کی ہے تو توبہ کا چوتھا جزیہ ہے کہ

(۴) بندے کا حق ادا کرے یا معاف کرائے۔

یہی وہ توبہ ہے جس سے واقعی انسان گناہوں سے دھل جاتا ہے۔ اس کا ایک ایک گناہ اس کی روح سے ٹپک کر گر جاتا ہے اور وہ اعمال صالحہ سے سنور کر آراستہ زندگی کے ساتھ خدا کے حضور پہنچتا ہے اور خدا اس کو اپنی جنت میں ٹھکانا بخشتا ہے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے ''بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب میں ایک سیاہ داغ پڑ جاتا ہے''۔ اب اگر وہ گناہ سے باز آ جائے۔ اپنے گناہوں کے احساس سے نادم ہو کر بخشش کا طلب گار ہو۔ اور خدا کی طرف پلٹ کر گناہ سے بچنے کا عزم مصمم کرے تو خدا اس کے قلب کو جلا بخش دیتا ہے اور اگر وہ پھر گناہ کر بیٹھے تو اس سیاہ داغ میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔ یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر خدا نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے۔

''ہرگز نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ان کے قلوب پر ان کے برے کرتوتوں کا زنگ چڑھ گیا ہے''۔ (المطففین ۸۳:۱۴)

7۔ اپنی توبہ پر قائم رہنے کا پختہ عزم کیجئے اور شب و روز دھیان رکھیے کہ خدا سے کئے ہوئے عہد و پیمان کے خلاف کوئی حرکت نہ ہونے پائے اور اپنی روز افزوں پاکیزگی اور اصلاح خال سے اپنے عزم کا اندازہ کرتے رہیے اور اگر اپنی ساری کوششوں کے باوجود بھی آپ پھسل جائیں اور پھر کوئی خطا کر بیٹھیں تب بھی مایوس ہرگز نہ ہوں، بلکہ پھر خدا کے دامن مغفرت میں پناہ تلاش کیجیے اور خدا کے حضور گڑگڑائیے کہ پروردگار! میں بہت کمزور ہوں، لیکن تو مجھے اپنے دَر سے ذلت کے ساتھ نہ نکال اس لئے کہ میرے لئے تیرے در کے سوا اور کوئی در نہیں ہے

جہاں جا کر میں پناہ لوں۔

حضرت شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے:

الٰہی بذلت مرا از درم کہ جز تو ندارم درِ دیگرم

اور حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ کی یہ رباعی بھی بہت ہی خوب ہے:

باز آ ہر آں چہ ہستی باز آ گر کافر و گبر بت پرستی باز آ

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

''پلٹ آ خدا کی طرف پلٹ آ تو جو کچھ اور جیسا بھی ہے خدا کی طرف پلٹ۔ اگر تو کافر اور بت پرست ہے تب بھی خدا کی طرف پلٹ آ۔ ہمارا یہ دربار مایوسی اور ناامیدی کا دربار نہیں ہے اگر تو نے سو بار بھی توبہ کر کر کے توڑ دی ہے تب بھی پلٹ آ۔''

خدا کو سب سے زیادہ خوشی جس چیز سے ہوتی ہے وہ بندے کی توبہ ہے توبہ کے معنی ہیں پلٹنا، رجوع ہونا، بندہ جب فکر و جذبات کی گمراہی میں مبتلا ہو کر گناہوں کی دلدل میں پھنستا ہے تو وہ خدا سے بچھڑ جاتا ہے اور بہت دور جا پڑتا ہے گویا خدا سے وہ گم ہو گیا اور جب وہ پھر پلٹتا ہے اور شرمسار ہو کر خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو یوں سمجھیے کہ گویا خدا کو اپنا گم شدہ بندہ پھر مل گیا۔ اس پوری کیفیت کو نبی ﷺ نے انتہائی بلیغ تمثیل میں یوں بیان فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم میں سے کسی شخص کا اونٹ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں گم ہو گیا ہو اور اس شخص کا کھانے پینے کا سامان بھی اسی گم ہونے والے اونٹ پر لدا ہوا ہو اور وہ شخص چاروں طرف اس لق و دق صحرا میں اپنے اونٹ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مایوس ہو چکا ہو پھر وہ زندگی سے بے آس ہو کر کسی درخت کے نیچے موت کے انتظار میں لیٹ رہا ہو۔ ٹھیک اسی حالت میں وہ اپنے اونٹ کو سارے سامان سے لدا ہوا اپنے پاس کھڑا دیکھے تو تصور تو کرو اسے کیسی خوشی ہو گی! تمہارا پروردگار اس شخص سے بھی کہیں زیادہ اس وقت خوش ہوتا ہے جب تم میں سے کوئی بھٹکا ہوا بندہ اس کی طرف پھر پلٹتا ہے اور گمراہی کے بعد پھر وہ فرمانبرداری کی روش اختیار کرتا ہے۔ (ترمذی)

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے اسی حقیقت کو ایک اور تمثیل میں واضح فرمایا ہے جو نہایت ہی اثر انگیز ہے: ''ایک موقع پر کچھ جنگی قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس کا دودھ پیتا بچہ چھوٹ گیا تھا۔ وہ مامتا کی ماری ایسی بے قرار تھی کہ جس چھوٹے بچے کو پا لیتی اپنی چھاتی سے لگا کر دودھ پلانے لگتی، اس عورت کا یہ حال دیکھ کر نبی ﷺ نے صحابہؓ سے پوچھا کیا تم توقع کر سکتے ہو کہ یہ ماں اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھوں آگ میں پھینک دے گی؟ صحابہؓ نے کہا: ''یا رسول اللہ! خود پھینکنا تو درکنار، وہ اگر گرتا ہو تو یہ جان کی بازی لگا کر اسے بچائے گی۔'' اس پر نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خدا اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ رحیم اور مہربان ہے جتنی یہ ماں اپنے بچے پر مہربان ہے۔''

8۔ توبہ اور استغفار برابر کرتے رہیے۔ صبح سے شام تک انسان سے نہ معلوم کتنی خطائیں ہوتی رہتی ہیں اور بعض اوقات خود انسان کو ان کا شعور نہیں ہو پاتا۔ یہ نہ سوچیے کوئی بڑا گناہ ہو جانے ہی پر توبہ کی ضرورت ہے، انسان ہر وقت توبہ و استغفار کا محتاج ہے اور قدم قدم پر اس سے کوتاہیاں ہوتی رہتی ہیں۔ خود نبی ﷺ دن میں ستر ستر بار اور سو سو بار توبہ و استغفار فرماتے تھے۔ (بخاری، مسلم)

9۔ جو گناہ گار توبہ کر کے اپنی زندگی کو سدھار لے اسے کبھی حقیر نہ سمجھیے۔ حضرت عمران بن الحصینؓ دورِ رسالت کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت نبی ﷺ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی جو بدکاری کے نتیجہ میں حاملہ ہو گئی تھی۔ کہنے لگی یا رسول اللہ ﷺ! میں زنا کاری کی سزا کی مستحق ہوں۔ مجھ پر شرعی حد قائم فرمایئے اور مجھے سزا دیجیے۔ نبی ﷺ نے اس عورت کے ولی کو بلایا اور اس سے کہا تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہو اور جب اس کا بچہ پیدا ہو جائے تو اسے میرے پاس لے کر آنا۔ ولادت کے بعد جب وہ عورت آئی تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کے کپڑے اس کے جسم پر باندھ دیے جائیں (تاکہ سنگسار ہوتے وقت کھل نہ جائیں اور بے پردگی نہ ہو)

پھر اُسے سنگ سار کرنے کا حکم دیا۔ اور وہ سنگ سار کر دی گئی۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے اس کے جنازے کی نماز پڑھی تو حضرت عمرؓ نے نبی ﷺ سے کہا۔ یا رسول اللہ ﷺ! آپ اس کے جنازے کی نماز پڑھ رہے ہیں یہ تو بدکاری کر چکی ہے، اس پر نبی ﷺ نے فرمایا اس نے توبہ کر لی اور ایسی توبہ کہ اگر اس کی توبہ مدینے کے ستر آدمیوں پر تقسیم کر دی جائے تو سب کی نجات کیلئے کافی ہو جائے۔ تم نے اس سے افضل کسی کو دیکھا ہے جس نے اپنی جان خدا کے حضور پیش کر دی۔

10۔ سید الاستغفار کا اہتمام کیجئے۔ نبی ﷺ نے حضرت شداد بن اوسؓ کو بتایا کہ سید الاستغفار یعنی سب سے عمدہ دعا یہ ہے:

''خدایا! تو میرا پروردگار ہے۔ تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں نے تجھ سے بندگی اور اطاعت کا جو عہد و پیمان باندھا ہے اس پر اپنے بس بھر قائم رہوں گا اور جو گناہ بھی مجھ سے سرزد ہوئے ان کے نتائج بد سے بچنے کیلئے میں تیری پناہ گاہ کا طالب ہوں تو مجھے جن جن نعمتوں سے نوازا ہے ان کا میں اقرار کرتا ہوں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں گناہ گار ہوں، پس اے میرے پروردگار! میرے جرم کو معاف فرما دے، تیرے سوا میرے گناہوں کو اور کون معاف کرنے والا ہے۔'' (بخاری، ترمذی)

☆......☆......☆

حافظ محمد ادریس

مکہ کا فاتح، دلوں کا فاتحؐ

اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ماہ رمضان ہے۔ رمضان جب بھی آتا ہے اپنے ساتھ فیوض و برکات اور رحمت و انعامات لے کر آتا ہے۔ وہ رمضان تو تاریخ میں یادگار ہے جب اللہ کے آخری نبیؐ بیت اللہ میں بیٹھے رحمت کا دریا بہا رہے تھے۔ رمضان کی برکات اپنی جگہ مگر حضورؐ رحمتوں کا جو خزانہ بانٹ رہے تھے وہ اپنی مثال آپ تھا۔ رمضان کے پہلے دو عشرے ختم ہو چکے تھے۔ آخری عشرہ شروع ہو گیا۔ حرم مکی میں زمین سے لے کر آسمان تک نور ہی نور تھا۔ نورِ وحی اور نورِ نبوت کے سنگم نے عجیب سماں باندھ رکھا تھا! رحمت کا دریا جوش میں تھا۔ پیاسے خوب سیراب ہو رہے تھے۔ جس مکہ سے اہل ایمان کو ظلم و ستم کے ساتھ نکال دیا گیا تھا آج وہ اسلام کے سامنے سرنگوں اور مفتوح ہو چکا تھا۔

آٹھ سال کی مختصر مدت میں وہ عظیم الشان انقلاب برپا ہو گیا تھا جس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ کمزور اور بے بس، اللہ کی نصرت سے آج غالب تھے اور طاقتور اور بے پناہ وسائل کے مالک آج مغلوب ہو چکے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں فتوحات بھی بہت ہیں اور فاتحین بھی کثیر، مگر یہ فتح بھی منفرد ہے اور یہ فاتح بھی بے مثال! جن لوگوں نے دشمنی کی آخری حدود پھلانگ لی تھیں انھیں سب سے زیادہ نوازا گیا۔ حکم ہوا سب کے لیے عام معافی کا اعلان کر دو۔ آج کسی سے بدلہ نہ لیا جائے گا۔ ہجرت کی شب حضورؐ کے گھر کا محاصرہ کرنے والے چودہ سرداروں میں سے گیارہ سردار ٹھیک چھے سال قبل انھی دنوں میں رمضان ۲ھ میں معرکہ بدر میں تہ تیغ ہو چکے تھے۔ جو تین بدر کے میدان سے غیر حاضر رہے وہ زندہ سلامت موجود تھے، ان کا نام لے کر حکم نبوی یوں صادر ہوا:

''ابوسفیان بن حرب، حکیم بن حزام اور جُبَیر ابن مُطعِم کو امان دے دی گئی ہے۔ ان کی دیوار کے سائے میں بھی جو بیٹھ جائے اسے بھی امان ہے۔''

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادئ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ!

قریش کے سبھی سردار آج مکے میں موجود تھے مگر ایک اہم شخصیت غائب تھی۔ جب سب ہتھیار ڈال چکے تھے اس وقت بھی وہ اکیلا مقابلے پر ڈٹا ہوا تھا۔ ۲۸ قریشی قتل اور دو اہل ایمان معمولی جھڑپ میں شہید ہوئے۔ مقابلہ کرنے والا بے بس ہو گیا۔ مکہ فتح ہو گیا تو اس نے حسرت بھرے الفاظ میں کہا: ''اگر خالد بن ولید کئی سال قبل ساتھ نہ چھوڑ چکا ہوتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔'' یہ بھی محض ایک خیال تھا۔ خالد بھی ہوتا تو کیا ہو سکتا تھا، فیصلہ تو اوپر سے صادر ہوتا ہے اور وہ ہو چکا تھا۔ بھلا اللہ سے کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ بہرحال وہ شہر چھوڑ کر نامعلوم منزل کی جانب نکل گیا۔ یہ بھی مہاجر تھا مگر اپنی انا کے راستے میں ہجرت کر کے گیا، اللہ کی راہ میں نہیں! اللہ کے رسولؐ نے سب سرداروں کو اپنے سامنے موجود پایا مگر اس سخت جان مزاحم سردار کا نام و نشان نہ تھا۔ آنحضورؐ اس کے بارے میں اپنے دل میں سوچتے رہے۔ آج حرم مکی میں آسمان سے رحمتیں نازل ہو رہی تھیں اور زمین پر فیوض و برکاتِ نبوت کا دریا پورے جوبن پر تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ بابِ بنوشیبہ سے ایک خاتون حرم میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کے بچے بھی تھے۔ یہ خاتون قریش کی معزز ترین خواتین میں سے تھی۔ اس کا

نام اُمِّ حکیم بنت حارث مخزومیہ تھا۔ اس کے والد ابوجہل کے حقیقی بھائی اور اس کی والدہ فاطمہ بنت ولید خالد بن ولید کی حقیقی بہن تھی۔ وہ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کی بیوی تھی۔ رسولِ خدا کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کی بہو بھی اور بھتیجی بھی!

عکرمہ آخری وقت تک مقابلہ کرنے کے بعد مکہ سے بھاگ کر چلا گیا تھا۔ اس کے بیوی بچے پریشان اور اداس تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ یہ عکرمہ کے بیوی بچے ہیں تو آپؐ نے گرمجوشی سے استقبال کیا اور اپنی طرف سے ان کے ساتھ محبت و شفقت کا بھرپور اظہار فرمایا۔ پھر پوچھا: ''ان بچوں کا باپ کہاں ہے؟'' تو بتایا گیا کہ وہ سقوطِ مکہ کے بعد یمن کی طرف بھاگ گیا ہے۔ اُمِّ حکیم نے مزید عرض کیا: ''یارسول اللہ! کیا اسے بھی امان مل سکتی ہے؟'' آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیوں نہیں، جاؤ میں نے اسے بھی امان دے دی ہے۔''

اُمِّ حکیم کا دل ایک جانب اس معافی سے مطمئن ہوگیا، دوسری جانب اسے فاتح کی عظمت کا پتا چل گیا کہ وہ کتنے بڑے دل گردے کا مالک اور کس قدر رحیم و مہربان ہے۔

عکرمہ جو جدہ کے ساحل سے کشتی میں سوار ہوکر راہ فرار اختیار کر چکا تھا، کشتی کے شدید طوفان میں پھنس جانے کی بدولت خوابِ غفلت سے بیدار ہوگیا۔ خشکی پر جو عقدہ سالوں میں نہ کھلا وہ سمندر میں چند لمحوں میں کھل گیا۔ ملاحوں نے مسافروں سے کہا: ''ایک اللہ وحدہٗ لاشریک کو مدد کے لیے پکارو۔'' قرآن مجید میں یہ مضمون کئی مقامات پر بیان ہوا ہے کہ جب کشتی بھنور میں پھنس جاتی ہے تو ایک اللہ کو پکارتے ہیں، دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ یہاں ہم سورۂ یونس آیت ۲۲ کا ترجمہ یاددہانی کے لیے لکھ رہے ہیں:

وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔

چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوکر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کرکے اس سے دعائیں مانگتے ہیں: ''اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکرگزار بندے بنیں گے۔'' مگر جب وہ ان کو بچالیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہوکر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ لوگو، تمھاری یہ بغاوت تمھارے ہی خلاف پڑ رہی ہے۔ دنیا کی زندگی چندروزہ مزے ہیں (لوٹ لو) پھر ہماری طرف تمھیں پلٹ کر آنا ہے، اس وقت ہم تمھیں بتادیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔

عکرمہ نے سوچا کہ یہی تو جھگڑا تھا جس نے گھروں سے بے گھر کر دیا۔ کل ہمارے دشمنوں کو اور آج مجھے۔ دل نے فیصلہ کرلیا کہ اگر خشکی پر پہنچا تو واپس مکہ چلا جاؤں گا۔ پنجابی زبان میں ضرب المثل ہے کہ ''مکے گیاں گل مکدی نئیں جے دلوں ناں مکائیے۔'' یہ محض مکہ کی جانب واپسی نہ تھی، یہ فطرت اور حقیقت کی جانب رجوع تھا۔ جو بات آج تک سمجھ نہ آئی تھی وہ اللہ نے طوفان میں سمجھا دی۔ جب یہ قریشی سردار واپس پہنچا اور بارگاہ نبوی میں حاضری دی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے پناہ مسرت ہوئی۔ آپؐ نے گرم جوشی سے مرحبا کہتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ اس کی واپسی محض مکہ کی طرف نہ تھی بلکہ دل کی دنیا میں ایک حقیقی انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ یہ واقعہ خود حضرت عکرمہ کی زبانی المستدرک للحاکم اور جامع الترمذی میں بیان ہوا ہے۔ المستدرک میں حضرت عکرمہؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی مرحبا بالراکب المہاجر کے الفاظ بتکرار دو مرتبہ بیان کیے ہیں۔ (المستدرک، حدیث نمبر ۵۰۱۷، جامع الترمذی، حدیث ۲۷۳۰)

عکرمہ نے ایسا فاتح کہاں دیکھا تھا، صدق دل سے اسلام قبول کیا اور پھر ساری زندگی جہاد کے لیے وقف کر دی۔ شام و روم کے معرکوں کے دوران دونوں میاں بیوی جہاد میں شریک رہے۔ جنگ یرموک میں عکرمہؓ بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے اور اُمِّ حکیمؓ

بیوہ ہوگئیں۔ یہ وہی جنگ تھی جس میں تین جان بازوں نے پانی کی پیاس کے باوجود دوسرے بھائی کی آواز سن کر پیالہ آگے بڑھا دیا۔ تینوں تشنہ کام ہی حوض کوثر کو چل دیے مگر ایثار کا وہ نمونہ پیش کیا جو تاریخ انسانی میں ایک ہی بار ظہور پذیر ہوا۔ ان میں سے ایک عکرمہؓ تھے، دوسرے سہیل بن عمروؓ اور تیسرے عکرمہؓ کے چچا حارث بن ہشام۔ اُمِّ حکیمؓ نے خود بھی مشکل گھڑیوں میں مجاہدین کے ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ وہ بڑی بہادر خاتون تھیں۔

اس وقت مشرق ومغرب ہر جگہ امتِ مسلمہ پر دشمن کی یلغار جاری ہے۔ یہ یلغار میدان جنگ تک محدو د نہیں۔ کھیت کھلیان، کوچے و بازار اور مسلمانوں کے گھر گھروندے سبھی دشمن کی زد میں ہیں۔ مرد ہی نہیں خواتین اور بچے بھی ننگی جارحیت کا شکار ہو رہے ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے اور اُمِّ حکیمؓ کی بیٹیاں عرب وعجم ہر جگہ اپنے مردوں، بھائیوں اور بیٹوں کے شانہ بشانہ داد شجاعت دے رہی ہیں۔ ان پُر آشوب حالات میں آج بھی ایسے ایمان افروز واقعات رونما ہو رہے ہیں کہ ان کا تذکرہ محفلوں میں ایک روحانی ماحول اور دلوں میں حصولِ جنت کا شوق پیدا کر دیتا ہے۔ تاریخ میں مذکور صحابہ وصحابیات کے زندہ و جاوید تذکرے دلوں کی ویران کھیتیوں کو سیراب کر دیتے اور باطل کی اندھی قوت کو للکارنے کا ولولہ سینوں میں بیدار کر دیتے ہیں۔ ان چراغوں کو ہر گھر اور محفل میں روشن کرنے کی ضرورت ہے۔ انھی کی روشنی سے اندھیرے بھاگیں گے۔ یہ ارشاد نبوی کہ جہاد قیامت کے دن تک جاری رہے گا، دشمن کو بہت کھلتا ہے مگر اپنے بیگانے سبھی کو جان لینا چاہیے کہ اس حکم کو کوئی منسوخ نہیں کر سکتا۔ جہاد زندہ باد۔ مجاہدین اسلام پائندہ باد۔

ہمارے پاس وسائل کی کمی نہیں اگرچہ دشمن کے مادی وسائل ہم سے بھی کئی گنا زیادہ ہیں۔ ہمارے پاس وہ ایمانی قوت ہے جس سے ہمارا دشمن محروم ہے۔ ہماری پشت پر ایک زریں تاریخ ہے جس میں قلت تعداد ہمیشہ کثرت پر غالب آتی رہی ہے، مگر اللہ کے اذن اور اس کی نصرت سے۔ اس کی نصرت حاصل ہوتی ہے، اس کی اور اس کے محبوبؐ کی غیر مشروط اطاعت سے۔ یہ اہتمام ہو سکے تو ممولہ شاہباز سے ٹکرا سکتا ہے۔

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے!

☆......☆......☆

پروفیسر الیف الدین ترابی

مسئلہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادیں

گزشتہ دنوں آرمی چیف نے بھارت کی طرف سے ورکنگ باؤنڈری پر جارحیت اور شہریوں کی شہادت پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ مسئلہ کشمیر کا حل اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہونا چاہیے تاکہ کشمیریوں کو بھارت کے غاصبانہ قبضے سے نجات ملے۔ زیرنظر مضمون اسی پس منظر میں شائع کیا جارہا ہے۔ (مدیرہ)

کشمیری عوام کی لازوال جدوجہد:

کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضے کے بعد گزشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ کے دوران میں کشمیری عوام نے مسئلہ کشمیر کے حل، آزادی اور حق خودارادیت کے حصول کیلئے کبھی پرامن سیاسی جدوجہد کی شکل میں اور کبھی مسلح مزاحمت کی صورت میں مسلسل جدوجہد جاری رکھی ہے۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے جو عظیم الشان قربانیاں دی ہیں ان کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہاں ہم نمونے کے طور پر چند مثالیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

1947ء میں جموں میں تقریباً 3 لاکھ سے زیادہ مردوں، عورتوں اور بچوں نے آزادی کیلئے اپنی جانیں پیش کیں۔ اور تقریباً 5 لاکھ مردوں، عورتوں اور بچوں کو انتہائی بے بسی کے عالم میں اپنے گھربار چھوڑ کر ہجرت اختیار کرنا پڑی۔ 1965ء میں یہ خون آشام داستان ایک بار پھر دہرائی گئی جب صوبہ جموں کے مسلم اکثریت کے اضلاع پونچھ اور راجوری کے کئی ہزار مردوں، عورتوں اور بچوں کو اس جرم کی پاداش میں یا تو قتل کر دیا گیا اور یا پھر زندہ جلا دیا گیا۔ جبکہ ایک لاکھ سے زیادہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں اپنے گھربار چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اسی طرح 1990ء میں شروع ہونے والی تحریک مزاحمت کے دوران میں بھارتی قابض فوجوں کی طرف سے اب تک ایک لاکھ سے زیادہ بے گناہ نہتے مرد، عورتیں اور بچے انتہائی بے بسی کے عالم میں شہید کر دیئے گئے ہیں جبکہ اس سے زیادہ بڑی تعداد میں بے گناہ مرد، عورتیں اور بچے زخمی اور اپاہج بنا دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک لاکھ سے زیادہ مکانوں اور دکانوں کو بارود اور پٹرول کا چھڑکاؤ کر کے نذر آتش کر دیا گیا ہے۔ ریاست کے طول وعرض میں ہر شہر اور قصبے میں شہداء کے مزار ہیں جن میں لاکھوں کی تعداد میں شہداء مدفون ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں گمنام شہداء کی قبریں اس کے علاوہ ہیں۔ بستیوں کی بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہو چکی ہیں جس کے نتیجے میں کشمیر کی جنت نظیر وادی اب موت کی وادی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آج کشمیر کا کوئی گھر ایسا نہیں جس میں کسی ماں، بہن یا بیٹی نے اس عظیم مقصد کیلئے اپنی سب سے عظیم متاع نہ لٹائی ہو۔ مختصر یہ کہ مسلمانان کشمیر نے اپنی آزادی اور حق خودارادیت کیلئے جو عظیم الشان اور لازوال قربانیاں پیش کی ہیں ان کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔

لیکن یہ ایک المیہ ہے کہ آزادی اور حق خودارادیت کے جس عظیم مقصد کیلئے مسلمانان کشمیر نے اتنی عظیم اور لازوال قربانیاں پیش کیں، اس کے حوالے سے بعض حلقوں کی طرف سے دانستہ یا نادانستہ اور کنفیوژن کی ایک ایسی فضا ہموار کی جارہی ہے جس کے نتیجے میں اس عظیم مقصد کے آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کا خدشہ ہے اور اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو یہ تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے نتیجے میں آزادی اور حق خودارادیت کیلئے پیش کی جانے والی ساری عظیم اور لازوال قربانیاں اکارت جائینگی۔ اس عظیم مقصد کیلئے دیا گیا لاکھوں شہیدوں کا لہو بھی رائیگاں جائے گا اور لاکھوں، ماؤں، بہنوں

اور بیٹیوں کی عصمتوں کی قربانی بھی بے مقصد ثابت ہوگی۔لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ گزشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصے کے دوران میں دی جانے والی جان و مال اور عزتوں کی ان عظیم اور لازوال قربانیوں کو رائیگاں جانے سے بچانے کیلئے کشمیری قائدین اور دانشور اپنے آپ کو بھی کنفیوژن کی اس کیفیت سے نکالیں اور کشمیری عوام کو بھی۔ ان حضرات کو یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ یہ کوئی پارٹی پالیٹکس کا حصہ نہیں ہے کہ جس کی بنیاد پر کوئی پارٹی اپنی سیاست چمکائے بلکہ یہ کشمیر کے ڈیڑھ کروڑ عوام کی آزادی اور حق خودارادیت کا مسئلہ ہے جس کیلئے انہوں نے گزشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصے کے دوران میں ان گنت اور لازوال قربانیاں پیش کی ہیں۔

مسلمانان کشمیر اپنی آزادی اور حق خودارادیت کی منزل کس طرح حاصل کر سکتے ہیں اس کا تمام تر دارومدار مسئلہ کے صحیح حل پر ہے اور مسئلہ کشمیر کا صحیح حل کس طرح ممکن ہے؟ اس کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اب تک اس کے حل نہ ہونے کی وجوہات کیا ہیں؟ چنانچہ اس موضوع پر ہم اسی پہلو سے گفتگو کرتے ہیں۔

مسئلہ کشمیر کی بنیاد، اقوام متحدہ کی قراردادیں:

1947ء کے اواخر میں بھارت نے کشمیر میں مجاہدین کے ہاتھوں اپنے متوقع انجام کو دیکھتے ہوئے مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اٹھانے کا فیصلہ کیا اور یوں یہ مسئلہ یکم جنوری 1948ء کو اقوام متحدہ کے چارٹر کی دفعہ 35 کے تحت سلامتی کونسل میں پیش کر دیا گیا۔

سلامتی کونسل نے اس مسئلہ پر طویل بحث وتمحیص کے بعد 21 اپریل 1948ء کو اس کے حل کیلئے پانچ ممبروں پر مشتمل اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہندو پاک قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔کمیشن نے جو 7 مئی 1948ء کو معرض وجود میں آیا تھا، اس سلسلے میں اپنی ابتدائی قرارداد 13 اگست 1948ء کو منظوری کی لیکن اسے کئی پہلوؤں سے ناقص، غیر واضح اور نامکمل قرار دیتے ہوئے 5 جنوری 1949ء کو ایک دوسری قرارداد منظور کی جس میں مبہم اور غیر واضح امور کو واضح کیا گیا تھا۔یوں اس قرارداد کی حیثیت 13 اگست 1948ء کی قرارداد کی تکمیل کی تھی۔اس قرارداد میں خصوصیت سے غیر واضح امور کو واضح طور پر بیان کیا گیا۔

اولاً: 13 اگست والی قرارداد میں یہ کہا گیا تھا کہ استصواب رائے سے پہلے پاکستان تو اپنی افواج کے ریاست سے مکمل انخلا کا پابند ہوگا جبکہ بھارت صرف اپنی بیشتر فوجوں کو نکالنے کا پابند ہوگا اور اس کی فوجوں کی ایک خاص تعداد امن وامان بحال رکھنے کیلئے بدستور ریاست میں موجود رہے گی۔لیکن پانچ جنوری 1949ء کی قرارداد کی دفعات میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ ریاست میں پرامن حالات قائم ہونے کے بعد ناظم رائے شماری بھارتی حکومت کے ساتھ مشورہ کر کے کشمیر سے بھارتی افواج کے حتمی انخلا کا فیصلہ کرے گا جس میں ریاست کے تحفظ اور استصواب رائے کے آزادانہ انعقاد کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے گا۔

ثانیاً: 13 اگست کی قرارداد میں استصواب رائے کے طریق کار کو غیر واضح چھوڑ دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ دونوں حکومتیں قرارداد کے باقی حصہ پر عملدرآمد کے بعد کمیشن سے اس بارے مذاکرات کریں گی جبکہ 5 جنوری 1949ء کی قرارداد کی دفعہ (ا) میں استصواب رائے کے معاملے کا تقسیم برصغیر کے اصولوں کے مطابق واضح طور پر تعین کر دیا گیا اور کہا گیا کہ ریاست کے بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کا مسئلہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے طے کیا جائے گا۔

ثالثاً: 13 اگست والی قرارداد میں بھارتی جبر وتشدد کے نتیجے میں (ریاست) سے ہجرت کرنے والے کشمیری مجاہدین مقیم پاکستان کے حق رائے دہی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔جبکہ 5 جنوری 1949ء کی قرارداد کی دفعہ 6 (الف) میں ایسے تمام مہاجرین اور تارکین وطن کے حق رائے دہی کو واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

غرضیکہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے پاک و ہند کی 13 اگست 1948ء کی قرارداد کئی اعتبار سے ناقص اور غیر واضح تھی۔اور اگر 5 جنوری

1949ء کی قرارداد کے ذریعے اس کے مبہم اور ناقص پہلوؤں کو واضح نہ کیا جاتا تو بھارت ان کی من مانی تعبیر کر کے جو رنگ چاہتا دے دیتا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ پاکستان نے 13 اگست 1948ء کی قرار داد کے مبہم اور غیر واضح پہلوؤں کو خود کمیشن کے ذریعے واضح طور پر متعین کرانے کا اہتمام کیا تا کہ بعد میں بھارت ان کی من مانی توجیہہ اور تعبیر نہ کر سکے۔ یوں 5 جنوری 1949ء کی قرارداد میں سابقہ قرار داد کے تمام مبہم اور غیر واضح پہلوؤں کو واضح طور پر متعین کرانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ 5 جنوری 1949ء کی قرار داد دراصل 13 اگست 1948ء کی قرارداد کی طرح واضح تر اور مکمل تر صورت ہے۔ اس قرارداد کے بعد 13 اگست 1948ء کی قرارداد کی کوئی علیحدہ صورت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرنے کے سلسلے میں بھارت کی یقین دہانیاں:

اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاک کی ان قراردادوں کو پاکستان اور بھارت نے بھی تسلیم کیا تھا اور پوری عالمی برادری نے بھی۔ اگرچہ بھارت ان قراردادوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ لیکن وہ 1956ء تک عالمی برادری کو ان قراردادوں پر عمل درآمد کے بارے میں یقین دہانی کراتا رہا ہے۔ یہاں ہم اس سلسلے میں بھارتی لیڈروں کی چند یقین دہانیوں کا حوالہ دے رہے ہیں۔

☆16 جنوری 1951ء کو پنڈت نہرو لندن میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اپنی اس یقین دہانی کو ان الفاظ میں دہراتے ہیں۔

''ہم پہلے دن سے اس موقف کے علمبردار رہے ہیں کہ کشمیری عوام کو اس بات کا حق ملنا چاہیے کہ وہ استصواب رائے کے ذریعے خود اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کریں۔''

☆12 فروری 1951ء کو وہ بھارتی پارلیمنٹ سے اپنے خطاب کے دوران میں ایک بار پھر کہتے ہیں۔

''ہم نے کشمیری عوام سے بھی یہ عہد کر رکھا ہے کہ اور اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے عالمی برادری سے بھی، کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام کو کرنا ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی اپنے اس عہد پر قائم چلے آ رہے ہیں اور آئندہ بھی قائم رہیں گے۔''

☆6 جولائی 1951ء کو آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پنڈت جی ایک بار پھر یقین دہانی کراتے ہیں۔

''یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ کشمیر کوئی خرید وفروخت کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اپنا ایک وجود اور تشخص ہے، لہٰذا اس کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حتمی حق صرف اور صرف کشمیری عوام کو حاصل ہے۔''

☆ یکم جنوری 1954ء کو کلکتہ میں ایک جلسہ عام کے دوران میں پنڈت نہرو کشمیر میں رائے شماری کے انعقاد سے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کے بارے میں اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ہم نے مسئلہ کشمیر کو خود اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا ہے اور اس کو پرامن طور پر حل کرنے کیلئے اپنا قول دیا ہے اور ایک عظیم قوم کی حیثیت سے ہم اپنے اس قول سے پھر نہیں سکتے ہیں۔ ہم نے یہ مسئلہ اب کشمیری عوام پر چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا اس بارے میں کشمیری عوام جو فیصلہ بھی کریں گے ہم اس کے پابند رہیں گے۔

☆26 جون 1952ء کو بھارتی پارلیمنٹ میں بیان دیتے ہوئے پنڈت نہرو ایک بار پھر کہتے ہیں۔

''اگر رائے شماری کے نتیجے میں کشمیری عوام اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتے ہیں تو ہم ان کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے پابند ہیں۔ چاہے ہمیں اس سے کتنا ہی دکھ کیوں نہ ہو۔''

☆7 اگست 1952ء کو انہوں نے بھارتی پارلیمنٹ میں جو بیان دیا

اس میں وہ اپنے موقف کو زیادہ واضح انداز میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''میں اپنی اس یقین دہانی کو ایک بار پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ کشمیر کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق صرف کشمیری عوام کو حاصل ہے، میں یہ اس لئے نہیں کہتا ہوں کہ ہم نے ان سے عہد کر رکھا ہے کہ یا اقوام متحدہ میں اس بات کی یقین دہانی کر رکھی ہے بلکہ میں یہ اس لئے بھی کہتا ہوں کہ یہ ہماری پالیسی کا ایک لازمی تقاضا ہے جو ہم نے نہ صرف مسئلہ کشمیر بلکہ دیگر مسائل کے بارے میں بھی اختیار کر رکھی ہے۔

☆ 20 اگست 1953ء کو نئی دہلی میں پاکستان اور بھارت کے وزرائے اعظم کی ملاقات کے بعد منعقدہ ایک مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پنڈت نہرو کہتے ہیں۔

''کشمیری عوام کی رائے معلوم کرنے کا سب سے بہتر اور کامیاب طریقہ صاف ستھری اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کا انعقاد ہے۔''

☆ یکم جنوری 1954ء کو ممتاز بھارتی جریدہ ''THE STATES MAN'' کو انٹرویو دیتے ہوئے پنڈت نہرو ایک بار پھر کہتے ہیں۔

''جہاں تک مسئلہ کشمیر کا تعلق ہے، وہ اب بھی اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر پوری طرح موجود ہے۔ اس لئے ہم کشمیر کے بارے میں اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہم کشمیر کے بارے میں خود اپنی مرضی سے کوئی قانون بنانے، فیصلہ کرنے اور اقدام کرنے کے مجاز ہیں۔''

☆ 18 مئی 1954ء کو پنڈت نہرو ہندوستانی ریاستوں کے سربراہوں کی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنے موقف کا اعادہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''جہاں تک بھارت کا تعلق ہے وہ مسئلہ کشمیر بارے میں اپنی بین الاقوامی یقین دہانی اور معاہدوں پر عملدرآمد کا اب بھی پوری طرح پابند ہے۔

☆ اسی طرح 31 مارچ 1955ء کو بھارتی پارلیمنٹ میں بیان دیتے ہوئے پنڈت نہرو ایک بار پھر کہتے ہیں۔

''کشمیر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے بھارت یا پاکستان میں سے کوئی بھی ہڑپ کر لے۔ بلکہ کشمیر کا اپنا ایک وجود ہے اور اپنی ایک روح ہے، اس لئے کشمیر کے مستقبل کے بارے میں کشمیری عوام کی رائے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔''

اس کے بعد اگرچہ مختلف حیلوں بہانوں سے بھارت نے ان قراردادوں پر عملدرآمد کرنے میں ٹال مٹول شروع کر دیا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ بھارت اپنے اس انکار کیلئے جو حیلے بہانے بھی پیش کر رہا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہیں، لہٰذا عالمی برادری نے کبھی انہیں تسلیم نہیں کیا۔ مسئلہ کشمیر آج بھی اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر موجود ہے اور اس کے بارے میں یہ قراردادیں بھی موثر ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ گزشتہ ایک مدت سے ان قراردادوں پر عمل درآمد کیلئے عالمی سطح پر کوئی موثر اور نتیجہ خیز کوشش نہیں کی گئی۔ جس کی وجہ سے بھارت کو ان قراردادوں پر عمل درآمد کیلئے آمادہ نہیں کیا جا سکا لیکن اس سے ان قراردادوں کی نوعیت اور قانونی و آئینی اہمیت پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوا بلکہ اب جب کہ مقبوضہ کشمیر میں آزادی وحق خودارادیت کی تحریک ایک فیصلہ کن دور میں داخل ہو چکی ہے اور اسلامیان کشمیر نے اپنی لازوال قربانیوں سے اس مسئلے کو ایک بار پھر عالمی توجہ کا مرکز بنا دیا ہے، مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ان قراردادوں کے حل کیلئے بھارت پر عالمی دباؤ بھی روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ جس کی ایک مثال گزشتہ عرصے کے دوران میں اسلامی کانفرنس کی طرف سے مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرنے کے مطالبے پر مبنی قرارداد کی منظوری ہے۔

تقسیم برصغیر کے اصولوں کے علی الرغم اقوام متحدہ کی قراردادوں سے ہٹ کر آزادی کشمیر کیلئے کی جانے والی کسی بھی مہم جوئی کے درج ذیل نقصانات بالکل واضح ہیں۔

1-اقوام متحدہ کی قراردادوں سے دستبرداری سے مسئلہ کشمیر کی بین الاقوامی حیثیت ختم ہوجائے گی۔

مسئلہ کشمیر کی متنازعہ بین الاقوامی حیثیت صرف اور صرف تقسیم برصغیر کے اصولوں اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کی وجہ سے ہے۔ اگر ایک بار ان دونوں بنیادوں کو ختم کر دیا گیا تو اس مسئلہ کی بین الاقوامی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ اور بھارت اس مسئلے کو پنجاب اور آسام کی طرح اپنا داخلی مسئلہ قرار دے کر آزادئ کشمیر کی تحریک کو کچلنے کیلئے جو اقدام کرنا چاہے گا، کر گزرے گا اور اس پر بین الاقوامی برادری کے احتجاج کو اپنے ''داخلی معاملات میں مداخلت'' کہہ کر مسترد کر دے گا۔

2-اقوام متحدہ کی قراردادوں سے دستبرداری کے نتیجے میں مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں سفارتی حمایت حاصل نہیں رہے گی۔

مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی قراردادیں پوری عالمی برادری نے تسلیم کر رکھی ہیں۔ اور خود بھارتی حکمران بھی (ایک طویل مدت)1956ء تک ان قراردادوں پر عملدرآمد کے بارے میں عالمی سطح پر یقین دہانیاں کراتے رہے ہیں۔ اب بھارت اگرچہ ان قراردادوں پر عملدرآمد کرنے سے انکار کر رہا ہے لیکن اس انکار کی کوئی قانونی یا اخلاقی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا بھارت کو اس بات کا خدشہ ہے کہ جب بھی اس مسئلے کے دوسرے فریقوں پاکستان اور کشمیری عوام کی طرف سے ان قرار دادوں پر عملدرآمد کیلئے کوئی منظّم سفارتی مہم چلائی گئی تو یقیناً پوری عالمی برادری ان کا ساتھ دے گی اور اس کا کچھ اندازہ بھارت کو اسلامی سربراہ کانفرنس کے گزشتہ اجلاسوں میں مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کے بارے میں متفقہ قرارداوں کی منظوری نیز روس چین اور کئی دوسرے ممالک کی طرف سے اس مسئلے کے حل کیلئے اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کے مطالبے سے ہو چکا ہے۔ مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کے بارے میں عالمی برادری کی یہ تائید وحمایت پاکستان اور کشمیری عوام کی طرف سے سفارتی محاذ پر کسی منظّم اور موثر مہم کے آغاز سے پہلے ہی حاصل ہو چکی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح طور پر دکھائی دے رہی ہے، کہ انشاءاللہ ایک منظّم سفارتی مہم کے نتیجے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے عالمی برادری کی بھرپور تائید اور حمایت حاصل کی جاسکتی ہے۔ جس کے بعد بھارت کیلئے کشمیر میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق استصواب رائے کرائے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہ جائے گا۔

3- اقوام متحدہ کی قراردادوں سے دستبرداری کے نتیجے میں پاکستان مسئلہ کشمیر کا فریق نہیں رہے گا۔

اقوام متحدہ کی ان قراردادوں اور تقسیم برصغیر کے اصولوں کے مطابق پاکستان مسئلہ کشمیر کا ایک باقاعدہ فریق ہے۔ چنانچہ ان قرار دادوں کی رو سے وہ اس مسئلہ کو اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل میں بھی اٹھا سکتا ہے اور دوسرے عالمی اداروں میں بھی۔ نیز تحریک آزادی کشمیر کی اخلاقی اور سیاسی امداد بھی کھل کر کر سکتا ہے۔ مسئلے کا ایک فریق ہونے کی وجہ سے اسے تحریک آزادی کشمیر کی اس اخلاقی، سیاسی اور ڈپلومیٹک تائید و حمایت سے کسی صورت بھی نہیں روکا جا سکتا۔ لیکن ان قراردادوں سے دستبرداری کے بعد پاکستان نہ تو اس مسئلے کا فریق رہے گا اور نہ ہی وہ اس مسئلے کے حل کیلئے کوئی کوشش کرنے یا تحریک آزادی کشمیر کی سیاسی اور اخلاقی تائید وحمایت کرنے کا مجاز رہے گا۔

4-اقوام متحدہ کی قراردادوں سے ہٹ کر رائے شماری کی صورت میں کشمیری عوام کے ووٹ تقسیم ہو جائیں گے۔

اگر ریاست میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق رائے شماری کرائی جاتی ہے تو کشمیری عوام کے سامنے صرف دو راستے ہوں گے یا تو انہیں بھارت کے ساتھ الحاق کے حق میں ووٹ دینا ہو گا یا پھر پاکستان کے حق میں، ایسی صورت میں غیر مسلم تو سارے کے سارے بھارت کے حق میں ووٹ دیں گے اور مسلمانوں میں سے بھی بھارت

کے وہ نمک خوار اسی کے حق میں ووٹ دیں گے جنہیں وہ گزشتہ ساٹھ سال سے زیادہ عرصے سے نوازتا چلا آ رہا ہے۔ باقی سارے مسلمان ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں ووٹ دیں گے۔ اور یوں کشمیر بھارت کے قبضے سے آزاد ہو کر پاکستان کا حصہ بن جائے گا۔ لیکن اگر یہ رائے شماری اقوام متحدہ کی قراردادوں سے ہٹ کر کسی اور بنیاد پر ہوتی ہے اور اس میں بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کے دو راستوں کے ساتھ ایک تیسرا راستہ خود مختار کشمیر کا بھی کھلا رکھا جاتا ہے تو اس صورت میں رائے شماری کے نتیجے میں غیر مسلموں اور بھارت کے نمک خوار نیشنل کانفرنسیوں اور کانگریسیوں کے ووٹ تو بھارت کے ساتھ الحاق کے حق میں پڑیں گے البتہ باقی مسلمانوں کے ووٹ جو پہلے صرف پاکستان کے الحاق کے حق میں تھے، دو حصوں میں بٹ جائیں گے اور یوں رائے شماری کے باوجود نہ صرف یہ کہ مقبوضہ کشمیر بھارت کے تسلط سے آزاد نہیں ہو سکے گا۔ بلکہ خاکم بدہن ریاست کا آزاد حصہ (آزاد کشمیر بشمول گلگت بلتستان) بھی اس کے غاصبانہ تسلط میں چلا جائے گا۔

5- اگر تقسیم برصغیر کے اصولوں کے علی الرغم اور اقوام متحدہ کی قراردادوں سے ہٹ کر رائے شماری کی صورت میں بفرض محال کشمیر خود مختار ملک بن بھی جاتا ہے تو چونکہ اس کا قیام تقسیم برصغیر کے بنیادی اصول، دو قومی نظریئے کے بجائے نیشنلزم اور سیکولرازم کی بنیاد پر عمل میں آئے گا، اس لئے ایسی صورت میں وہ قدرتی طور پر انہی نظریات پر قائم ہونے والے ملک بھارت کا حلیف ہو گا نہ کہ وہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر معرض وجود میں آنے والے ملک پاکستان کا اور ایسی صورت میں یہ ملک کہنے کو تو آزاد اور خود مختار ہو گا لیکن عملاً اس کی حیثیت، بھوٹان، سکم اور نیپال کی طرح بھارت کی ایک کٹھ پتلی کی سی ہو گی جسے وہ باآسانی پاکستان اور عالم اسلام کے خلاف اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کیلئے ایک اڈے کے طور پر استعمال کر سکے گا۔

6- اسلامیان کشمیر کی موجودہ تحریک آزادی کا جذبہ محرکہ اور سرچشمہ قوت اسلام اور صرف اسلام ہے، لہٰذا اگر اس تحریک کو اس کے اس سرچشمہ قوت اور جذبہ محرکہ سے بیگانہ کر کے اس کا رشتہ سیکولرازم اور نیشنلزم کے لادینی نظریات سے استوار کر دیا گیا تو یہ تحریک اپنی موت آپ مر جائے گی۔ اس لئے کہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ مسلمان اپنے دین کیلئے تو اپنی جانیں ہزار بار بھی قربان کرنے کیلئے تیار ہو سکتے ہیں لیکن کسی دوسرے مقصد کیلئے جان دینا ان کے نزدیک گناہ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی جان کو اللہ کی امانت سمجھتے ہیں جو صرف اور صرف اسی کی راہ میں اسی کی رضا کیلئے دی جا سکتی ہے اور جب مسلمانان کشمیر کا جذبہ قربانی ماند پڑ گیا تو یہ تحریک بھی از خود ماند پڑ جائے گی۔

اس گفتگو سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ بھارتی سامراج کے ہمنوا بعض عالمی سامراجی حواریوں یا ان کے ایجنٹوں کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے اقوام متحدہ کی قراردادوں سے ہٹ کر جو تجاویز سامنے آ رہی ہیں ان کی حقیقت کیا ہے، چاہے یہ تجاویز، تھرڈ آپشن کے نام سے ہوں یا کسی اور نام سے۔ ضرورت اس امر کی ہے کے ہمارے ارباب حل وعقد اور اصحاب فکر و دانش نیز تحریک آزادی کشمیر کے قائدین بھارت کی ان سازشوں اور ریشہ دوانیوں اور ان کے پس پردہ عزائم پر پوری طرح نگاہ رکھیں اور بھارتی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے اس دام ہم رنگ زمیں میں پھنس کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس کے نتیجے میں خدانخواستہ بھارت کو آزادی کشمیر کی اس عظیم تحریک کو سبوتاژ کرنے کا موقع مل جائے اور وہ مسئلہ کشمیر کو خود ہمارے ہی ہاتھوں ختم کرانے میں کامیاب ہو جائے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو یہ ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہو گا۔ بقول علامہ اقبالؒ

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

مسئلہ کشمیر کے حل کا امریکی روڈ میپ:

امریکی اور اس کی حواری دیگر استعماری قوتوں کی ہمیشہ سے یہ

کوشش رہی ہے کہ عالم اسلام کے مسائل یا تو حل ہی نہ ہونے پائیں، اور اگر ان کا کوئی حل نکلنا ہی ہے تو وہ امریکہ کے مفادات کے تابع ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان میں سے ہر مسئلے کیلئے ایک خصوصی روڈ میپ ہے۔ جسے وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے وقتاً فوقتاً پیش کرتی رہتی ہیں۔ اسی طرح مسئلہ کشمیر کے حوالے سے بھی امریکہ کا ایک خصوصی روڈ میپ ہے، جو اس نے اپنے ایک آلہ کار پاکستان کے ایک سابق صدر جنرل پرویز مشرف کے ذریعے 4 ستمبر 2006ء کو پیش کیا تھا۔ اس کے مطابق پرویز مشرف نے مسئلہ کشمیر کے حوالے سے پاکستان کے اصولی موقف سے دستبرداری کا اعلان کرتے ہوئے اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے ایک چار نکاتی فارمولا پیش کیا جو حسب ذیل نقاط پر مشتمل ہے۔

اولاً: آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کی سرحدوں میں کسی قسم کی تبدیلی لائے بغیر دونوں خطوں کے عوام کو آر پار جانے کی آزادی دی جائے۔

ثانیاً: ریاست کو داخلی خود مختاری دی جائے جو بہر حال مکمل خود مختاری نہیں ہوگی۔

ثالثاً: ریاست کے دونوں حصوں (آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر) سے فوجوں کی بتدریج واپسی کے ساتھ ساتھ مجاہدین کو بھی غیر مسلح کیا جائے۔

رابعاً: ریاست کا نظام چلانے کیلئے پاکستان، بھارت اور کشمیری نمائندوں پر مشتمل مشترکہ اتھارٹی قائم کی جائے۔

جنرل پرویز مشرف کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے پیش کردہ اس فارمولے کو کشمیری عوام اور ان کی حقیقی قیادت نے بھی مسترد کر دیا اور حکمران اتحاد چھوڑ کر پاکستان کی تمام سیاسی و دینی جماعتوں نے بھی کھل کر اس کی مخالفت کی۔ اس لئے کہ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے پاکستان کے اصولی موقف سے دستبرداری کا مطلب جہاں ایک طرف کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی تائید وحمایت سے دستبرداری کا اعلان ہے وہاں دوسری طرف اس اصولی موقف سے دستبرداری کا مطلب پاکستان کی بقاء وسالمیت کو داؤ پر لگانے اور اپنی شہ رگ کو خود اپنے ہاتھوں دشمن کے شکنجے میں دینے کے مترادف ہے۔ اسی طرح اس فارمولے کے ذریعے نہ صرف یہ کہ حالیہ تحریک آزادی کشمیر کے دوران میں دی جانے والی جان و مال اور عزتوں کی قربانیوں کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے بلکہ پاکستان کی بقاء وسالمیت کو بھی داؤ پر لگا دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تحریک آزادی کشمیر کے ممتاز قائد اور روح رواں جناب سید علی گیلانی نے، جو کشمیر میں آزادی وحق خودارادیت کی علمبردار جماعت آل پارٹیز حریت کانفرنس کے چیئرمین بھی ہیں، صدر پرویز مشرف کے اس فارمولے کو امریکی فارمولہ قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا اور کہا کہ یہ فارمولہ کشمیری عوام کے حق خودارادیت کے منافی اور موجودہ تحریک کے دوران میں دی گئی جان و مال اور عزتوں کی قربانیوں سے غداری کے مترادف ہے۔ اسی طرح 17 جنوری 2006ء کو اس فارمولے پر انگوٹھا لگوانے کیلئے میر واعظ عمر فاروق کے دورہ پاکستان کے ڈرامے کے آغاز کے موقع پر سید علی گیلانی صاحب کی اپیل پر کنٹرول لائن کے دونوں اطراف کے کشمیری عوام نے اس کے خلاف ہمہ گیر اور بے مثال ہڑتال کر کے یہ ثابت کر دیا کہ انہیں مسئلہ کشمیر کا یہ امریکی حل کسی طور پر قبول نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کشمیر کی مجاہد تنظیموں پر مشتمل اتحاد، متحدہ جہاد کونسل کی طرف سے بھی اس فارمولے کو مسترد کرتے ہوئے اسے کشمیر کے ایک لاکھ سے زیادہ شہیدوں کے مقدس لہو سے غداری قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں موتمر عالم اسلامی کے زیر اہتمام منعقدہ قومی مشاورت نے بھی جس میں پاکستان اور آزاد کشمیر کی تمام دینی و سیاسی جماعتیں شریک تھیں، صدر پرویز مشرف کے اس فارمولے کو تحریک آزادی کشمیر کے تقاضوں اور پاکستان کی بقاء وسالمیت کے منافی قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔ اسی طرح 19 جنوری 2006ء کو میر واعظ گروپ کے صدر مشرف سے مذاکرات کے موقع پر جہاد کشمیر کے دوران میں شہید ہونے والے شہدائے کرام کے وارثوں کی طرف سے امریکی حل کے خلاف

مظاہرے نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ بھی اسے تحریک جہاد کشمیر کے خلاف سازش سمجھتے ہیں۔

مسئلہ کشمیر کے حوالے سے امریکی روڈ میپ کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کیلئے اس حقیقت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ 11 ستمبر 2001ء کے واقعات کا بہانہ بنا کر امریکہ نے نام نہاد دہشتگردی کے قلع قمع کے نام پر اسلام اور عالم اسلام کے خلاف جو صلیبی جنگ شروع کر رکھی ہے اور جس کا سلسلہ روز بروز وسعت اختیار کرتا جارہا ہے اس جنگ میں امریکہ نے واضح طور پر دوملکوں اسرائیل اور بھارت کو اپنا قدرتی حلیف اور سٹریجٹیک پارٹنر قرار دے رکھا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر امریکہ کی پالیسیوں کا مرکز و محور یہ ہے کہ وہ اپنے تمام اقدامات میں اس بات کو یقینی بنائے کہ اس اقدام کے نتیجے میں امریکی مفادات کے ساتھ ساتھ امریکہ کے ان دونوں حلیفوں اسرائیل اور بھارت کے مفادات کا تحفظ بھی ہو بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ امریکی انتظامیہ میں موجود صیہونی لابی کا اثر ونفوذ اب اس درجہ کو پہنچ چکا ہے کہ امریکی پالیسیوں میں بھارت اور اسرائیل کے مفادات کے تحفظ کو محور کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ اس سلسلے میں امریکی انتظامیہ اقدامات کرتے ہوئے نہ بین الاقوامی اصول وضوابط کا پاس ولحاظ رکھتی ہے اور نہ اسے اس بات کی پرواہ ہوتی ہے کہ اس سے خود امریکہ کی اپنی ساکھ اور مفادات پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسرائیل کی طرف سے مسئلہ فلسطین کے بارے میں سلامتی کونسل کی قراردادوں کی مسلسل خلاف ورزی اور فلسطینی عوام کے خلاف بڑے پیمانے پر ریاستی دہشتگردی کے باوجود امریکہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس کے ساتھ کھڑا ہے۔ اور اس سلسلے میں نہ اسے اس بات کی پرواہ ہے کہ اس کے نتیجے میں اس کے سلامتی کونسل کی قرار دادوں اور چارٹر کی پاسداری کے حوالوں سے بلند و بانگ دعوؤں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے اور نہ اس بات کی کہ اسرائیل کی طرف سے فلسطینی عوام کے خلاف جاری ریاستی دہشتگردی کی مسلسل تائید وحمایت کے بعد نام نہاد دہشتگردی کے خلاف جنگ کے امریکی دعوؤں پر کون اعتبار کرے گا اور نہ اس بات کی کہ چند لاکھ یہودیوں پر مشتمل اسرائیل کی طرف سے دنیا کے ڈیڑھ ارب کے قریب مسلمانوں کے قبلہ اول پر غاصبانہ تسلط کی ناجائز تائید وحمایت کی اس پالیسی کے نتیجے میں پوری مسلم دنیا میں امریکی ساکھ اور مفادات پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ امریکہ نے محض اسرائیل کے ناجائز وجود اور قبلہ اول پر اس کے غاصبانہ تسلط کی غیر آئینی اور غیر اخلاقی تائید وحمایت جاری رکھتے ہوئے پوری اسلامی دنیا سے لڑائی مول لے رکھی ہے۔ اسرائیل کی طرح اپنے دوسرے قدرتی حلیف اور سٹریٹیجک پارٹنر بھارت کے حوالے سے بھی امریکی پالیسی بے جا تائید و حمایت اور اصولوں سے انحراف کے اسی رویے پر قائم ہے۔

مسئلہ کشمیر کے حوالے سے امریکی روڈ میپ کے اہم اہداف:

بھارت اور امریکہ کے درمیان سٹریجٹیک پارٹنر شپ اور ایٹمی تعاون کے اس منظر نامے کو سامنے رکھا جائے تو اس بات کا با آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے امریکی روڈ میپ کے اہداف اور خدوخال کیا ہوں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح مسئلہ فلسطین کے حل کیلئے امریکی روڈ میپ کا بنیادی مقصد مشرق وسطیٰ میں امریکہ اور اسرائیل کے مفادات کے تحفظ اور اسرائیلی بالادستی کو یقینی بنانا ہے، بالکل اسی طرح مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے امریکی روڈ میپ کا بنیادی مقصد برصغیر جنوبی ایشیاء میں امریکہ اور بھارت کے مفادات کے تحفظ اور بھارت کی بالادستی کو یقینی بنانا ہے۔ لہٰذا اس مقصد کی تکمیل کیلئے مسئلہ کشمیر کے حل کی غرض سے مجوزہ امریکی روڈ میپ کے اہم اہداف حسب ذیل ہیں۔

1- مسئلہ کشمیر کا ایک ایسا حل مسلط کرنا جس کے نتیجے میں خطے میں امریکہ اور اس کے سٹریجٹیک پارٹنر بھارت کی بالادستی یقینی بن جانے کے ساتھ ساتھ دونوں کے مفادات کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

2- مسئلہ کشمیر کا ایک ایسا حل مسلط کرنا جس کے نتیجے میں کشمیری عوام حق خود ارادیت کی منزل سے ہمکنار ہونے سے پہلے ہی داخلی خود مختاری کے نام سے دوبارہ بھارتی غلامی کے دام ہمرنگ زمین میں گرفتار ہو جائیں۔

3- پاکستان کو مسئلہ کشمیر کا ایک ایسا حل قبول کرنے پر مجبور کرنا جس کے نتیجے میں پاکستان کی شہ رگ مکمل طور پر بھارتی گرفت میں چلی جائے اور بھارت کشمیر سے پاکستان کی طرف آنے والے دریاؤں کے رخ کو جیسے چاہے موڑ سکے۔

4- ریاست پر مشترکہ کنٹرول کے پردے میں بھارت کو اس بات کا موقع مہیا کرنا کہ وہ اپنے اثر ونفوذ کا دائرہ آزاد کشمیر وگلگت بلتستان تک بڑھا کر پاکستان اور چین کے مابین زمینی رابطے کو منقطع کر سکے۔

5- اس طرح ریاست پر مشترکہ کنٹرول کے بہانے بھارت کو اس بات کا موقع مہیا کرنا کہ اس کی فوجیں کہوٹہ کے ایٹمی پلانٹ سے فائرنگ رینج کی حدود میں آزاد کشمیر تک رسائی حاصل کر لیں۔

6- ریاست جموں وکشمیر کی غیر معمولی سٹریٹجک اہمیت کے پیش نظر امریکہ کو یہاں پر پنجے گاڑنے کیلئے اڈے فراہم کرنے کی سہولت مہیا کرنا، تاکہ وہ ایک طرف پاکستان کے مخلص دوست اور حلیف عوامی جمہوریہ چین کے خلاف گھیرا تنگ کر سکے اور دوسری طرف پاکستان کی شہ رگ بھارتی گرفت سے چھٹکارا حاصل کرنے سے پہلے ہی امریکی گرفت میں آجائے۔

7- پاکستان کو مسئلہ کشمیر کے حوالے سے سلامتی کونسل کی قراردادوں سے دستبرداری پر آمادہ کرنا، تاکہ وہ ایک طرف بھارت کیلئے سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت کے حصول کی راہیں ہموار ہو سکیں اور دوسری طرف پاکستان کیلئے مسئلہ کشمیر کے ایک باقاعدہ فریق ہونے کے جواز کو ختم کیا جا سکے۔

8- مقبوضہ کشمیر میں بھارت کے خلاف جاری تحریک مزاحمت کو سبوتاژ کرنے کیلئے ایک طرف اس کے جذبہ محرکہ اور نصب العین اسلام اور پاکستان سے بیگانہ کرنا اور دوسری طرف اس کی آئینی بنیادوں اور اقوام متحدہ کی قراردادوں سے محروم کرنا، تاکہ اس تحریک کے نتیجے میں کشمیری مسلمانوں کی تمناؤں کے مطابق مقبوضہ کشمیر کے بھارتی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد پاکستان کے ساتھ الحاق کی صورت میں پاکستان کے ایک عظیم تر اسلامی ملک کی صورت میں ابھرنے کا خدشہ باقی نہ رہے۔

9- مسئلہ کشمیر کو بھارتی مفادات اور مقاصد کے مطابق حل کرنے کے بعد دنیا کی واحد ایٹمی قوت پاکستان پر اپنا ایٹمی پروگرام رول بیک کرنے کیلئے دباؤ ڈالا جائے اور اس کیلئے یہ بہانہ بنایا جائے کہ مسئلہ کشمیر کے حل ہو جانے اور بھارت کے ساتھ تعلقات کی بحالی کے بعد اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

10- امریکہ کے سٹریٹجک پارٹنر بھارت کو ایک منی سپر پاور کے طور پر پروجیکٹ کر کے برصغیر جنوبی ایشیا میں اس کی بالادستی کو یقینی بنانا۔

11- مقبوضہ کشمیر میں جاری تحریک جہاد کو ختم کرنا تاکہ اس کے نتیجے میں ایک طرف بھارت کے امن وسلامتی کو لاحق خطرات کا ازالہ ہو سکے اور دوسری طرف اس تحریک کی کامیابی کے نتیجے میں برصغیر جنوبی ایشیا خصوصاً پاکستان کے مستقبل پر مرتب ہونے والے ممکنہ اثرات کا پہلے سے توڑ کیا جا سکے۔

12- تحریک آزادی کشمیر کی اسلام و پاکستان جہاد نیز شہداء کے مشن کی علمبردار قیادت کی جگہ ایک ایسی معتدل اور ماڈریٹ قیادت سامنے لانا جو شہداء کے مشن کی تکمیل پر اصرار کرنے کے بجائے مجوزہ امریکی روڈ میپ پر انگوٹھا لگانے کیلئے تیار ہو۔

13- پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات معمول پر لا کر یہاں پر بھارتی مصنوعات کیلئے مارکیٹ پیدا کی جائے۔

14- باہمی اعتماد کی بحالی کے اقدامات کے نام پر نام نہاد ثقافتی وفود

کی یلغار کے ذریعے پاکستان کے اسلامی تشخص وتہذیب کو بھارت کے ہندوانہ تشخص وتہذیب کے دھارے میں ضم کرکے پاکستان کے جداگانہ تشخص کے خاتمے کی راہیں ہموار کرنا۔

15- باہمی تعلقات کی بحالی اور دوستی کے پردے میں پاکستان کے نظریے اور وجود کے خلاف راہیں ہموار کرنا۔

کشمیر پالیسی۔اصلاح احوال کی ممکنہ صورتیں:

اب تک کی گفتگو سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مسئلہ کشمیر کو امریکی روڈ میپ کے مطابق حل کرنے کی جو سازش کی جارہی ہے اس کا اصل ہدف تحریک آزادی کشمیر کے اصول ومقاصد اور پاکستان کی بقاء وسالمیت کی قیمت پر مسئلہ کشمیر کا ایک ایسا حل مسلط کرنا ہے جو اہل کشمیر کی آرزوؤں اور تمناؤں کے مطابق آزادی وحق خود ارادیت کا باعث بننے کے بجائے برصغیر جنوبی ایشیا میں بھارت اور امریکہ کے مشترکہ مفادات ومقاصد کی تکمیل کی راہیں ہموار کرے اور جس کے نتیجے میں خطے میں امریکہ کے سٹریجٹیک پارٹنر اور پاکستان کے ازلی دشمن بھارت کو بالادستی حاصل ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس سازش میں پنہاں خطرات کا صحیح اور بھرپور ادراک کرتے ہوئے اس کا راستہ روکنے کیلئے تمام ممکنہ تدابیر بروئے کار لائی جائیں۔ میرے نزدیک اس سلسلے میں فوری طور پر مندرجہ ذیل اقدامات کی ضرورت ہے۔

☆ ریاست جموں وکشمیر کے دونوں حصوں میں تحریک آزادی سے وابستہ تمام افراد، سیاسی جماعتیں اور مجاہد تنظیمیں اس سازش میں پنہاں خطرات کا بھرپور ادراک کرتے ہوئے اس سے عہدہ برآمد ہونے کیلئے ایک مشترکہ حکمت عملی اختیار کریں۔

☆ پاکستان کے ارباب حل وعقد اور متعلقہ ادارے بھی اس روڈ میپ پر آنکھیں بند کرکے عمل درآمد کرنے کے بجائے آنکھیں کھول کر اس کے تمام پہلوؤں کا ٹھنڈے سے دل سے جائزہ لیں۔ اور امریکی اور بھارتی مقاصد کی تکمیل کیلئے تحریک آزادی کشمیر اور پاکستان کی بقاء و سالمیت کو داؤ پر نہ لگائیں۔

☆ پاکستان کے محبّ وطن اہل فکر و دانش اور صحافی حضرات بھی تحریک آزادی کشمیر اور پاکستان کی بقاء وسالمیت کو درپیش اس چیلنج کا بھرپور ادراک کرتے ہوئے اس کا راستہ روکنے کیلئے قوم میں شعور اور ادراک پیدا کرنے کا اہتمام کریں۔

☆ تحریک آزادی کشمیر کے مستقبل اور پاکستان کی بقاء وسالمیت کو درپیش اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کیلئے ایک مشترکہ قومی حکمت عملی تشکیل دینے کیلئے فوری طور پر ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی جائے اور اس مقصد کیلئے مستقل بنیادوں پر کام کرنے کیلئے ایک قومی کشمیر کمیٹی تشکیل دی جائے۔

☆ جناب میر واعظ عمر فاروق اور ان کے رفقائے کرام سے بھی گزارش ہے کہ وہ شہدائے کشمیر کے مقدس خون کی قیمت پر مسئلہ کشمیر کے حوالے سے اس امریکی روڈ میپ پر عملدرآمد کا حصہ بننے سے گریز کریں۔

☆......☆......☆

شمیم فاطمہ

حمدِ باری تعالیٰ

وہ محتاجوں ، گداؤں، شاہوں، سرداروں کو دیتا ہے
وہ داتا نیکو کاروں کو گنہ گاروں کو دیتا ہے

بلا تخصیص ہیں سب نعمتیں اس کی دو عالم پر
وہ اپنے منکروں اپنے طلب گاروں کو دیتا ہے

وہ بھر دیتا ہے اپنے ہاتھ سے جسموں کے زخموں کو
شفا اپنی طرف سے اپنے بیماروں کو دیتا ہے

وہی تو رات کو پابند کرتا ہے اندھیروں کا
وہ سورج کو بجھا کر روشنی تاروں کو دیتا ہے

وہی تو سمت دیتا ہے سحابوں کو، ہواؤں کو
وہی تو بے کلی دریاؤں کے دھاروں کو دیتا ہے

وہی تو نرم کرتا ہے زمیں بارش کی بوندوں سے
وہی تو سخت جانی ایسی کہساروں کو دیتا ہے

وہ دیتا ہے ضعیف و ناتواں چیونٹی کو بینائی
رہائی غم کے زنداں سے وہ لاچاروں کو دیتا ہے

وہی مشکل کشا ہے مشکلیں آسان کرتا ہے
وہی آرام سارے درد کے ماروں کو دیتا ہے

کرم کرتا ہے سب کے حال پر میرا سخی داتا
ہزاروں نعمتیں ہم جیسے ناکاروں کو دیتا ہے

غزل

جشنِ طرب نہ رقصِ طرحدار چاہیے
دل میں ہجومِ غم ہو تو غم خوار چاہیے

شہرِ نمود تیرے بھی دستور ہیں عجیب
چھوٹے سے چھوٹے سر کو بھی دستار چاہیے

پوری ہوں زندہ لوگوں کی جائز ضرورتیں
اس کے علاوہ کچھ نہیں سرکار چاہیے

شَہ کے حضور جرأتِ حق گوئی کے لیے
جوشِ جنون حوصلہِ دار چاہیے

خبریں فروغِ عظمتِ انساں کی جس میں ہوں
ہفتے میں ایک ایسا بھی اخبار چاہیے

ذرے میں آفتاب ہے قطرے میں جوئے آب
راہِ طلب میں دیدۂ بیدار چاہیے

نجمہ یاسمین یوسف

غزل

یقین آگیا محکم ہیں ہم پہ تقدیریں
کہ خاک ہوگئیں اپنی تمام تدبیریں

کسی سے عقدۂ تشخیصِ مرض کیا کھلتا
ہمی نہ کھینچ سکے درد دل کی تصویریں

مزاجِ یار ہو برہم تو ایسا لگتا ہے
ہوں جیسے سر پہ لٹکتی برہنہ شمشیریں

جو مہرو ماہ ہیں روشن جو آفتاب ہے گرم
ہیں میرے رب کی محبت کی ساری تفسیریں

کوئی ہنر میرے رب ایسا بخش دے مجھ کو
معاف ہو سکیں اپنی تمام تقصیریں

حصارِ ذات سے نکلے تو یہ ہوا معلوم
جہاں میں ہیں اہل ہنر کی تاثیریں

آمنہ رمیصا زاہدی

نمکین غزل

مانا اب کے بچے پختہ پکے ہوتے ہیں
کچھ ہو لیکن بچے پھر بھی بچے ہوتے ہیں
آخری سانسوں تک ان سب کو سہنا پڑتا ہے
جتنے بھی قسمت میں لکھے دھکے ہوتے ہیں
جو بھی اچھی باتیں ہیں زہریلی ہوتی ہیں
جو بھی سچ کے گھونٹ ہیں سارے کڑوے ہوتے ہیں
دائیں بائیں سب پر نظریں رکھنا لازم ہے
پھل میں بھی تو میٹھے کڑوے کھٹے ہوتے ہیں
ہار ہو یا ہو جیت، سبھی میں پیسہ چلتا ہے
کھیل کوئی بھی کھیلا جائے سٹے ہوتے ہیں
ہنر کھلاڑی کے بازو کے اندر ہوتا ہے
بیٹ میں کب پوشیدہ چوکے چھکے ہوتے ہیں
دینے والوں میں ہوتے ہیں کچھ ذہنی لاغر
لینے والوں میں بھی ہٹے کٹے ہوتے ہیں
دل کا حال بتاؤ لیکن یاد رکھو کچھ لوگ
پیٹ کے ہلکے اور کانوں کے کچے ہوتے ہیں
چکنی چپڑی کرنے والوں کی اس دنیا میں
سیدھی سادی باتوں میں بھی لچھے ہوتے ہیں
کمزوروں کے آگے بھی جھکنا پڑ جاتا ہے
مغروروں کے دانت بھی اکثر کھٹے ہوتے ہیں
چوک ذرا ہو جائے، چٹنی کر کے رکھ دیں گے
روز و شب کے چکر بھی سل بٹے ہوتے ہیں

حبیب الرحمٰن

قانتہ رابعہ

غیبی دروازہ

''بہن بشیراں ذرا دروازے پر آ کر میری بات سنو۔'' مالک مکان فضل گجر نے دھڑ دھڑ دروازہ پیٹتے ہوئے کہا۔ بس یوں سمجھئے کہ اعلان بگل بجایا۔

نقاہت اور بخار کا شکار بشیراں نے دوپٹے کے پلو سے اپنے ہاتھ پونچھے اور جل تو جلال تو کاورد کرتی باہر آئی۔

''جی بھا فضل......'' فکرمندی سے بشیراں نے جواب دیا۔

فضل پر تو اللہ کا فضل ہے لیکن لگتا ہے تیرا حال مندا ہی ہے آج میرا تیسرا چکر ہے، دو ماہ کا کرایہ اور تین ماہ کا بجلی کا بل جمع ہے تیری طرف۔ خالی ترس کھانے سے تو پیٹ نہیں بھرتا بہن میریئے۔ کچھ دانہ چوگا تو اس پاپی پیٹ کے لئے کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر نہیں کر سکتی تو نئے کرائے دار بننے کے لئے لائن لگی ہے آج آخری دفعہ بتا دے کب تک انتظار کروں؟ کھردرے لہجے میں فضل نے بات مکمل کی۔

آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں بھا جی، پہلے کا کا چھت سے گرا پھر منی کے لاکڑا کاکڑا نکل آیا۔ سکول گئی نہ تنخواہ ملی۔ کل انشاء اللہ جیوں، مروں ہر حال میں سکول جانا شروع کروں گی......''

بشیراں نے مِن مِن کرتے ہوئے بات مکمل کی۔

''یہ بات تو پچھلے چکر میں بھی سنائی تھی تم نے۔ آج کی نئی بات سناؤ۔'' سفاکی کے ساتھ کہا۔

''بیماروں کو بھگتا بھگتا کے خود بیمار ہو گئی تھی، ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے مجھے'' بے بسی سے بشیراں نے وضاحت کی۔

''او......ہو......اس کا مطلب ہے اگلے ماہ کا کرایہ بھی نہیں ملے گا۔ نہ...... نہ......کل دن کے دس بجے تک کرائے کا بندوبست ہونا چاہیے ورنہ گیارہ بجے نئے کرائے داروں کا سامان ڈیوڑھی میں پڑا ہو گا۔ روز روز تو حق مانگنے میں بھی نہیں آ سکتا۔''

بات مکمل کر کے اس نے ٹھاہ سے دروازہ بند کیا اور ساتھ ہی بشیراں کی آس امیدوں کا دروازہ بند ہو گیا۔ جیسے آنکھوں میں مٹھی بھر مٹی ڈالی گئی ہو۔ پورا جسم پسینے میں نہا گیا اور چکرا کر وہیں گر گئی......آنکھیں بند ہوتے ہوتے ہوش و خرد کی دنیا سے وقتی طور پر بیگانہ ہوتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک ہی پکار تھی۔

زمین و آسمان کے خزانوں کے مالک کوئی غیبی دروازہ میرے لئے بھی کھول دے میری مشکل آسان ہو جائے......اٹھارہ سو پچھتر روپے۔ صرف اٹھارہ سو پچھتر روپے......ہزار روپے موجود ہیں......بس اٹھارہ سو پچھتر روپے مزید......''

داستانِ غربت بشیراں کی بھی وہی تھی جو ساری بے کس اور بے بس بیواؤں کی ہوتی ہے۔ خاوند نشئی تھا اللہ جانے کیسے مر مرا گیا۔ دو بچے جس سکول میں زیر تعلیم تھے اسی سکول میں وہ صفائی ستھرائی کا کام کرتی تھی۔ پوری بستی غریب غرباء کی تھی کپڑا سلواتے تو تب تک پیچھا نہ چھوڑتے جب تک وہ خود پہننے والے کی جان نہ چھوڑتا۔ سلائی کا ہنر کبھی تھا ہی تو زنگ آلود ہو گیا۔ اسی سکول کے پاس فضل گجر کا ڈیڑھ مرلے کا گھر تھا۔ ہزار روپے کرائے کے اور بجلی کا بل آدھا۔ تھی تو نری بے انصافی خود تو مالک مکان بجلی کا بے دریغ استعمال کرے اور وہ خود ایک پنکھے ایک بلب کے ساتھ آدھے بل کی ذمہ دار ہو گئی۔ پر کیا کریں۔ کلجگ ہے بھئی کلجگ......! پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ میں وہ بس چار چھ دفعہ ہی سکول گئی...... پہلے ایک بچہ بیمار ہوا پھر دوسرا پھر خود بیمار ہو گئی۔ ہفتے میں بمشکل ایک آدھ دفعہ جانا ہوا اس کے پیسے کس سے مانگتی......! گھر میں گنتی کے دو بستر اور اڑھائی برتن تھے، کیا بیچتی اور کیا رکھتی۔

مالک مکان کو ان سب حالات کا علم تھا پر وہ بھی سچ کہہ رہا تھا اگر مالک مکان ترس کھائے تو کمائے کہاں سے! اس بار وہ آخری دفعہ آنے اور سامان نکال پھینکنے کی دھمکی دے گیا تھا۔ آس امید کسی جھروکے سے اندر آتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تصور ہی میں اپنا سامان سڑک پر پھینکا ہوا دیکھ کر وہ گرتی چلی گئی...... اللہ غیبی دروازہ کھول دے...... غیبی دروازہ!

آنکھ کھلی تو ناگوار سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی...... سپرٹ...... ٹنکچر آیوڈین...... ادویات...... ہسپتال...... نرس...... اور پاس بیٹھا مانوس سا چہرہ میڈم افشاں کا، جہاں وہ کام کرتی تھی اس کی ہیڈ مسٹرس، اس نے اٹھنا چاہا مودب ہو کر بیٹھنا چاہا لیکن میڈم صاحبہ نے اشارے سے روک دیا اور اس کے قریب آ ئیں۔

''کیسی ہو بشیراں؟''

''بہتر ہوں'' وہ سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ نقاہت کا شدید احساس تھا......

''میں کہاں ہوں میڈم صاحبہ اور میرے بچے؟'' وہ بولی۔

''سب ٹھیک ہیں۔ میں تو اتفاق سے تمہارے پاس آئی تھی، موبائل فون تمہارے پاس ہے نہیں، ضروری کام تھا تم سے، تمہارا دروازہ کھلا تھا اندر آ کر دیکھا تو تم بے ہوش پڑی تھیں۔ ڈرائیور سے کہہ کر ایمبولینس منگوائی اور ادھر لے آئی۔ کیا بات ہے ٹھیک نہیں ہوئیں تم؟ بھئی جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ مجھے تو ضروری کام ہے تم سے'' انہوں نے لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''جی حکم کریں......'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''بھئی بشیراں بات یہ ہے کہ پشاور والے سانحے کے بعد تمہیں تو پتہ ہی ہے حالات کیسے مشکل ہو گئے ہمارے لئے، ہمارے سکول کی دیواریں بھی چھوٹی ہیں کیمرے کا بھی انتظام یہاں نہیں ہو پا رہا تھا تو ہم نے سکول کچھ فاصلے پر شفٹ کر لیا ہے۔ بلڈنگ بڑی ہے اوپر والے حصے میں گھر ہے۔ مجھے آئے روز کسی نہ کسی میٹنگ میں جانا پڑتا ہے بچے اکیلے رہ جاتے ہیں میں نے یہ سوچا بھئی تم ہو تو ایماندار...... تمہاری بھی ضرورت پوری ہو جائے گی ہماری بھی...... سکول کے ایک طرف دو کمروں کا کوارٹر بنا ہوا ہے اگر تم وہاں شفٹ ہو جاؤ، میری غیر موجودگی میں میرے بچے پریشان نہیں ہوں گے میں بھی مطمئن رہوں گی کہ ان کے پاس کوئی ذمہ دار فرد موجود ہے۔ یہ پوچھنے بلکہ بتانے کے لئے تمہارے پاس آئی تھی تو تم بے ہوش پڑی تھیں۔

اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ ہم نے تو شفٹنگ شروع بھی کر دی ہے......'' انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''جی ٹھیک ہے......'' سر سے منوں وزنی بوجھ اتر گیا، بشیراں دوبارہ زندہ ہو گئی...... ''چلیے میڈم صاحبہ......'' اس نے بیڈ سے ٹانگیں نیچے کیں......

''اوہو...... ابھی تم یہیں رہو، نرس آ کر چھٹی دے گی تمہیں...... اور یہ......'' انہوں نے اپنا پرس کھولا...... ہم نے تمہیں مستقل ملازم کے طور پر رکھا ہے تو پچھلے دو ماہ کے یہ بقایا جات ہیں تمہارے، یہ لو......'' انہوں نے کڑکڑاتا ہوا نیلا نوٹ اسے تھمایا...... کانپتے ہاتھوں سے بشیراں نے نوٹ پکڑا۔ اس کے ساتھ ہی چڑمڑ سے دو تین نوٹ اور تھے۔ اس نے جلدی سے گنتی کی۔ کل رقم اٹھارہ سو پچھتر روپے تھی۔

صرف ایک دفعہ پکارنے پر...... کہ الٰہی غیبی دروازہ کھول دے، میری مشکل آسان کر دے...... غیبی دروازہ کھل چکا تھا۔ مفت میں نیا ٹھکانہ مل چکا تھا۔ مالک مکان کو دینے کے لئے اٹھائیس سو پچھتر روپے کی ضرورت تھی، ہزار پہلے سے موجود تھا۔ باقی رقم زمین و آسمان کے خزانوں کے مالک نے بھجوا دی تھی اور وہ گم سم بس یہی سوچے جا رہی تھی۔ پہلی دفعہ مانگنے پر اس نے وہاں سے دیا جہاں سے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

اور جو اسی کے در سے مانگتے ہیں......

اور مانگتے ہی رہتے ہیں......

ان کو وہ کیا کیا کچھ نہیں دیتا ہوگا! ☆

فرحی نعیم

امید کا جگنو

نفیسہ کچن میں دوپہر کیلیئے روٹی بنا رہی تھیں جب ہی نہ جانے کیوں ان کا اچانک دل گھبرانے لگا تھا انہوں نے پکی ہوئی روٹیوں کو دسترخوان میں لپیٹا چولہا بند کر کے گوندھے ہوئے آٹے کو اچھی طرح ڈھک کر کچن سے باہر آ گئیں۔اور صحن میں پڑے ہوئے تخت پر لیٹ گئیں۔علینہ نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

''کیا ہوا امی؟''

''بس نہ جانے کیوں دل اچانک بیٹھا جا رہا ہے۔'' وہ کچھ بے چینی سے بولیں۔

''میں آپ کیلیئے گلوکوز لاتی ہوں۔'' علینہ نے گود میں رکھی کتابوں کو جلدی سے سامنے پڑی میز پر رکھا اور پیر میں چپل ڈالتی ہوئی کچن میں بھاگی چند ہی منٹوں میں وہ ماں کے پاس بیٹھی انہیں گلوکوز پلا رہی تھی۔نفیسہ نے گلاس خالی کر کے علینہ کو پکڑایا اب چہرے پر ان کے کچھ سکون آ گیا تھا۔

''امی کچھ بہتر ہوا؟'' علینہ پریشان ہوگئی تھی۔

''ہاں......'' انہوں نے سر ہلایا...... اور پھر تکیہ درست کر کے دوبارہ سے لیٹ گئیں۔''علینہ میں نے روٹیاں پوری نہیں پکائی تھیں۔ تم......''

''امی آپ کیوں فکر کر رہی ہیں میں کر دوں گی لیکن یہ اچانک آپ کو کیا ہوا''......علینہ نے ماں کی بات کاٹ کر تشویش سے پوچھا۔

''بس کیا بتاؤں نہ جانے اچانک کیا ہوا۔''

''آپ آپی کی طرف سے پریشان ہیں نا۔'' اس نے کچھ جانچتی نظروں سے ماں کو دیکھا۔اور نفیسہ انکار نہ کر سکیں نظریں چراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور علینہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

''امی آپ فکر مند نہ ہوں آپی اپنے معاملات خود ہینڈل کر سکتی ہیں۔'' علینہ نے گویا انہیں تسلی دی۔

''ارے کیا خاک کر سکتی ہے شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں اور اس کے سسرال والوں نے اس عرصے میں اسے چین سے ایک دن بھی نہ رہنے دیا۔حالانکہ دو بچے بھی ہو گئے۔''

''کم از کم بچوں کے مستقبل کے بارے میں ہی سوچ لیں وہ لوگ...... گھر ٹوٹ جائے گا تو بچے رل جائیں گے۔لیکن انہیں کون سمجھائے میری بچی کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔رو رہی تھی آج بھی'' نفیسہ کے چہرے پر تکلیف دہ تاثرات تھے۔

''آپ کی بات ہوئی تھی آج آپی سے؟'' علینہ نے آج کا لفظ سن کر چونکتے ہوئے کہا۔

''ہاں کیا تھا فون اس نے رات پر پھر جھگڑا ہوا تھا۔ماں بھڑکاتی ہے بیٹے کو اور بیٹا بیوی پر چڑھ دوڑتا ہے۔'' نفیسہ نے تلخی سے کہا کہ نہ ساری رات خود سویا نہ بیوی کو سونے دیا۔بچے الگ پریشان کرتے رہے اس کو چھوٹی شیری کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔لیکن باپ بجائے بچوں کی پروا کرنے کے بیوی کے ہی لتے لیتا رہتا ہے۔'' وہ تو جیسے بھری بیٹھی تھیں بولنے پر آئیں تو بولتی چلی گئیں۔

''پھر آپ نے کیا کہا......'' علینہ کی آنکھوں میں بھی پریشانی تھی۔

''ارے میں نے کیا کہنا تھا۔سوائے صبر کرنے کے بس اللہ سے دعا ہی کر سکتی ہوں۔کہ ان لوگوں کو ہدایت دے دے۔''

''آمین'' علینہ نے زیر لب کہا۔امی نے آنکھیں موند لی تھیں۔

وہ تو بھی اٹھ کر واپس کرسی پر بیٹھ گئی اور میز پر سے اپنی کتابیں اٹھائیں لیکن اب پڑھائی میں جی نہ لگ رہا تھا۔اگلے ماہ اس کے فرسٹ ائیر کے امتحان تھے۔کالج سے چھٹیاں ہو چکی تھیں۔آج کل وہ گھر میں ہی سارا دن امتحانات کی تیاری کیلئے پڑھتی رہتی تھی۔کچھ کام ہوتا تو کسی کسی دن کالج کا چکر بھی لگا لیتی۔بہن کے حالات نے جیسے اسے وقت سے پہلے ہی بہت سمجھدار اور عقلمند کر دیا تھا۔لیلیٰ کے حالات کی کشتی شادی کے چند ماہ بعد سے ہی ڈگمگا رہی تھی۔اس کے سسرال والے بہت ہی تیز اور چالاک لوگ تھے۔اور لیلیٰ ان کے ہاتھوں میں کھلونا ثابت ہوئی تھی۔جسے وہ جب چاہتے تند و تیز طعنوں کے نشتر چبھوتے،توڑتے،مروڑتے اور واپس جوڑ لیتے۔لیکن یہ ٹوٹنے جڑنے کا عمل لیلیٰ کیلئے کتنا تکلیف دہ تھا یہ کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔وہ تو حالات کی چکی میں پسی جا رہی تھی۔لب شکوہ کناں بھی تھے کہ آخر یہ سب کب تک اس کے ساتھ ہوتا رہے گا۔

☆......☆......☆

ابھی وہ دونوں ماں بیٹی دوپہر کا کھانا کھا کر اٹھی ہی تھیں کہ دروازے کی گھنٹی بجی تھی علینہ نے دروازہ کھولا تو سامنے لیلیٰ دونوں بچوں کے ساتھ سوجھی آنکھیں لئے کھڑی تھی۔علینہ نے لپک کر دروازہ کے پاس پڑے لیلیٰ کے بیگ کو اٹھایا اور لیلیٰ کو اندر آنے کیلئے راستہ دیا۔

''علینہ پہلے رکشے والے کو کرایہ دے دو۔'' لیلیٰ کی آواز بیٹھی بیٹھی تھی۔تب علینہ نے گیٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑے رکشے پر نظر ڈالی وہ کرائے کا ہی منتظر تھا۔لیلیٰ کی بات سن کر وہ الٹے پیروں اندر بھاگی تھی پرس سے سو کا نوٹ نکال کر اس نے کرایہ دیا اور اندر کمرے میں آ گئی جہاں لیلیٰ ماں کے کندھے سے لگی بلک رہی تھی۔دونوں بچے وہیں کونے میں سہمی سہمی نظروں سے ماں کو دیکھ رہے تھے۔علینہ نے ہونٹ بھینچتے ہوئے یہ نمناک منظر دیکھا اور دونوں بچوں کو باہر لے آئی اگر وہ یہ نہ کرتی تو شاید کچھ ہی دیر میں وہ دونوں بھی ماں کے ساتھ شامل ہو جاتے۔

☆......☆......☆

نفیسہ نے لیلیٰ کو پانی پلایا اور کتنی ہی دیر تک اس کا سر اور کمر سہلا کر تھپکتی رہیں۔کافی دیر کے بعد لیلیٰ خاموش ہوئی تھی ورنہ لگتا تھا کہ آج تو وہ آنسو بہا بہا کر ماں کو بھی اس میں ڈبو دے گی۔بڑی مشکل سے سکون کی گولی دے کر علینہ نے لیلیٰ کو سلا دیا تھا۔اسے آرام کی شدید ضرورت تھی ویسے بھی وہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی اور نہ جانے کب سے رو رہی تھی۔رو رو کر اس کی آنکھیں سوجھ گئی تھیں گلا بھنچا ہوا تھا۔اور بخار بھی چڑھ گیا تھا۔بچوں کو علینہ نے کھلا پلا کر کھیل میں لگا دیا تا۔

''صبح سے میرا دل آج اسی لئے گھبرا رہا تھا میری بچی وہاں ان ناقدروں کے ہاتھوں ستائی جا رہی تھی تو میں کیسے سکون میں رہتی۔'' نفیسہ لیلیٰ کے سو جانے کے بعد علینہ کے پاس باہر کمرے میں آ کر بیٹھتے ہوئے بولیں آواز میں تھکن نمایاں تھی۔

''آخر امی یہ لوگ کب سدھریں گے۔انہیں تو بات بات پر لڑنے جھگڑنے کا بہانہ چاہیے ہوتا ہے اور یہ نبیل بھائی''......وہ چند لمحوں کیلئے رکی اتنے تو سمجھدار ہیں لیکن گھریلو سیاست میں ان کی عقل گم ہو جاتی ہے کیا......؟ جھوٹ سچ کی پہچان ہی نہیں رہتی۔ٹھیک ہے ماں کی حیثیت اپنی جگہ ہے لیکن بیوی کی بھی تو سنیں۔علینہ بھی بہن کی حالت دیکھ کر کڑھتے ہوئے بولی۔

''کیا کروں سمجھ نہیں آتا رات بھی ماں نے بے بنیاد بات پر جو فسانہ کھڑا کیا تو وہ بڑھتے بڑھتے اتنا بڑا بن گیا جھگڑا شروع کرتے ہیں تو مانو اگلی پچھلی ساری داستانیں جھوٹی سچی شروع کر دیتے ہیں۔ساس نندیں تو ہیں ہی وہ جٹھانی بھی اپنا حصہ ڈالنا فرض سمجھتی ہیں اور دو کی چار بنا کر لگاتی ہیں۔میں نے تو سوچ لیا ہے شام کو تمہارے ابا آئیں گے تو بات کروں گی۔آخر ایسا کب تک چلے گا۔ابھی تو دو ہی بچے ہیں ہم سنبھال لیں گے۔آگے اور ہو گئے تو کون سنبھالے گا ان کو یہ گاڑی مجھے

چلتی ہوئی نظر نہیں آتی۔''

آج پہلی دفعہ نفیسہ نے ایسی انتہائی بات کی تھی اور علینہ ماں کی بات سن کر ٹھٹھک گئی تھی۔ کیا واقعی صورتحال اتنی ہی خوفناک موڑ پر آ گئی تھی؟ ورنہ آج سے پہلے تک تو نفیسہ نے لیلیٰ کو ہمیشہ امید کی کرن ہی دکھائی تھی اسے اچھے دنوں کی آس ہی دلائی تھی۔ نفیسہ اتنا کہہ کر تھک کر وہیں ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی اور سوچوں میں ڈوب گئی تھی۔ رات کو ابا اور عارف بھی آ چکے تھے ان دونوں نے بھی لیلیٰ کی حالت دیکھ لی تھی اور آج اس کی جو حالت تھی وہ ایسی نہ تھی جو نظر انداز کی جا سکے۔ ابا تو جیسے خاموش سے ہو گئے تھے لیکن عارف جو لیلیٰ سے سال بھر ہی چھوٹا تھا اسے ایسی اجڑی حالت میں دیکھ کر برداشت نہ کر سکا۔

آخر آپ لوگ کب تک لیلیٰ کو اس جہنم میں جلنے کیلئے چھوڑ دیں گے؟ بس اب یہ قصہ ختم کریں۔ ابا آپ ان لوگوں سے بات کریں نبیل بھائی کو بلائیں ان سے دوٹوک بات کریں۔ میری بہن لاوارث نہیں ہے اس کے سر پر ماں باپ اور بھائی کا سایہ ہے لیلیٰ اب وہاں ہرگز نہیں جائے گی۔ عارف غصہ سے بول رہا تھا۔

''عارف جذباتی نہ بنو یہ بات کہنا جتنا آسان ہے اسے نبھانا اور کر گزرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ عورت کا اصل گھر اس کے شوہر کا ہی ہوتا ہے۔ والدین سدا سلامت نہیں رہتے اور رہا بھائی کا سہارا تو یہ بھی کوئی پائیدار نہیں ہے۔'' ابا عارف کو ٹھنڈا کرنا چاہ رہے تھے جب ہی اسے سمجھاتے ہوئے بولے۔

''ابا آپ کیا مجھے ایسا سمجھتے ہیں؟'' اسے ابا کی بات سے دکھ پہنچا تھا۔

''میں نے خاص یہ تمہارے لئے نہیں کہا بلکہ میں ایک عام معاشرتی رویہ بیان کر رہا ہوں۔ آج تم اکیلے ہو کل کو شادی ہو گی بچے ہوں گے تمہاری اپنی ایک زندگی شروع ہو جائے گی اس کے جھمیلوں میں پڑ کر تم اتنے مصروف ہو جاؤ گے کہ بہن اور اس کے بچوں کیلئے تمہارے پاس مشکل سے ہی وقت نکلے گا۔ تمہیں میری یہ باتیں دکھ تو دیں گی لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھو گے تو سمجھ جاؤ گے۔'' ابا اسے حقیقت کا سامنا کرانا چاہ رہے تھے۔

''تو کیا لیلیٰ کو ہم پھر وہیں سلگنے کیلئے چھوڑ دیں۔'' عارف کے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔

''میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ ہم اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے سوچتے ہیں پھر کوئی فیصلہ کریں گے۔ ابھی لیلیٰ کو یہیں رہنے دو تا کہ وہ پرسکون ہو جائے۔ اور میں نبیل سے بات کرتا ہوں۔''

''اور اس طرح ان پانچ سالوں میں کتنی دفعہ ہو چکا ہے۔ ہم نے کتنی دفعہ نبیل اور اس کے گھر والوں سے بات کی ہے۔ صلح صفائی ہوئی معاملات سلجھائے گئے معافی تلافی ہوئی لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوا۔ چند ہفتوں بعد پھر وہ اپنی پرانی ڈگر پر آ جاتے ہیں۔ عارف ٹھیک کہہ رہا ہے میں نے بھی سوچ لیا ہے اب یہ قصہ ختم ہی کر دیا جائے تو شاید سب کیلئے بہتر ہو گا'' امی کا انداز بھی کچھ کچھ فیصلہ کن تھا۔

''یہ تم کہہ رہی ہو جو آج سے پہلے ہمیشہ لیلیٰ کو صبر و برداشت کا سبق دیتی رہی تھیں؟'' ابا حیرانگی سے اماں کو دیکھ رہے تھے۔

''ہاں کیوں کہ اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ لیلیٰ کی برداشت سے بہت زیادہ ہے۔ میری بچی بہت ستم سہہ رہی ہے۔'' امی کی آواز بھرا سی گئی تھی۔

''کیا لیلیٰ نے ایسا کچھ کہا؟ کیا وہ بھی اب یہی چاہتی ہے۔'' ابا کی آواز میں لرزش تھی۔

''نہیں ایسا تو کچھ نہ کہا اس نے کہ وہ علیحدگی یا طلاق لینا چاہتی ہے لیکن اب بس مجھ سے یہ سب نہیں برداشت ہو رہا۔'' امی کی بات سن کر ابا نے گہری سانس لی انہیں اپنی بیٹی سے یہی امید تھی۔ اگر لیلیٰ نہیں چاہتی تو تم کیوں ایسی بات زبان پر لا رہی ہو۔''

''اس کے آنسو میرے دل پر گرتے ہیں خواجہ صاحب ماں ہوں

میں اس کی وہ اگر یہ بات خود سے نہیں کہہ رہی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ یہ چاہتی بھی نہیں۔ انسان ہے روبوٹ نہیں کہ مسلسل ظلم ہوتا رہے اور وہ سہتی رہے۔'' امی سے اب میاں کی یہ برداشت والی بات ہضم نہ ہوئی وہ جتانے والے انداز میں بولیں۔ بولتے بولتے ان کی آواز بھرانے لگی تھی۔

''اچھا اچھا تم ماں ہو تو میں بھی اس کا باپ ہوں جتنی محبت تم کرتی ہو اتنی ہی میں بھی کرتا ہوں اپنی اولاد سے بس میں کچھ آگے کا بھی سوچ لیتا ہوں اور تم صرف آج کا ہی سوچتی ہو۔'' ابا نے جیسے بات سمیٹنی چاہی ''بہر حال ابھی ہم لیلیٰ کو بالکل بھی نہیں چھیڑیں گے۔ تم اس کی دلجوئی کرو اور اسے سکون سے یہاں رہنے دو۔ میں بھی اس مسئلے کا حل سوچتا ہوں۔ بھائی صاحب سے بھی مشورہ کروں گا۔ نبیل سے بات کروں گا۔ تم لوگ پریشان نہ ہو جو کچھ ہوگا وہ لیلیٰ کیلئے بہتر ہی ہوگا۔'' ابا نے بیوی اور بیٹے کو مطمئن کیا اور وہ دونوں جواب میں خاموش ہی رہے۔

☆......☆......☆

ابا اگلے دن اپنے بڑے بھائی کے پاس گئے اور کافی دیر تک ان سے بیٹی کے سلسلے میں صلاح مشورہ کرتے رہے۔ بھائی صاحب کا بھی یہی خیال تھا کہ نبیل کو بلا کر اس سے تفصیلی اور قطعی بات کی جائے اور اگر نبیل راضی ہو جائے تو لیلیٰ کیلئے ایک علیحدہ گھر کا بندوبست کر دیا جائے تا کہ روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے امان مل جائے۔ لیکن یہ سب نبیل پر ہی منحصر تھا۔

☆......☆......☆

لیلیٰ کو آئے تین دن گزر چکے تھے وہ کافی حد تک نارمل ہو چکی تھی اور اب اسے نبیل کے فون یا اس کی آمد کا انتظار تھا۔ لیکن دوسری طرف ہنوز خاموشی تھی۔ لیلیٰ نے خود فون کرنا چاہا تو امی نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ لیلیٰ اب اس سے کسی قسم کی بات کرے جب تک بڑوں میں کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔ اور لیلیٰ خاموش ہو گئی تھی۔ شادی

کے بعد کے پانچ سال اس کیلئے کوئی اچھے اور خوشگوار ثابت نہ ہو سکے تھے اگر چہ نبیل بذات خود برا نہ تھا لیکن حسب روایت اس کی ماں بہنیں اور بڑی بھابی بڑی جھگڑالو اور رائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر تھیں۔ اور لیلیٰ ان سب کیلئے تر نوالہ ثابت ہوئی تھی۔ وہ سب اس کو اپنی مرضی کا غلام بنانا چاہتی تھیں۔ لیلیٰ ویسی ہی بن گئی تھی لیکن ساتھ ہی وہ چاروں یہ بھی چاہتی تھیں کہ نبیل کی نگاہ اس پر التفات نہ ہی ہو۔ اور اس مقصد کے حصول کیلئے وہ ہر غلط حربہ استعمال کرتیں۔ گھر میں اس کی حیثیت نوکروں سے بھی گئی گزری تھی۔ اس پر نبیل کے آنے پر نہ جانے کہاں کہاں کی جھوٹی سچی کہانیاں اس کی نسبت کر کے سنائی جاتیں کہ نبیل غصہ میں اندھا ہی ہو جاتا ہے تعلیم، عقل و شعور رکھنے کے باوجود ایسے وقت وہ بلا کا جاہل اور اجڈ لگتا ہے۔ اس کی سمجھ بوجھ اس وقت کوسوں دور چلی جاتی۔ اور اب تو نندوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑ رکھا تھا۔ وہ لیلیٰ کو شک کی نظر سے دیکھ رہی تھیں کہ لیلیٰ کا شادی سے پہلے کسی کے ساتھ سلسلہ چل رہا تھا اور اب پھر واپس سے رابطہ چل پڑا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں نبیل کے کان بھی خوب بھرے تھے کہ وہ اپنی بیوی کو کھینچ کر رکھے کہ سکول سے بیٹے کو لانے کے بہانے وہ کوئی چکر چلا رہی ہے۔ نبیل نے جب لیلیٰ سے اس سلسلہ میں پوچھ گچھ کی تو پہلے تو لیلیٰ نہیں سمجھی اس کے تو فرشتوں کو بھی یہ علم نہ تھا کہ اس کے خلاف اب کوئی نئی سازش تیار کی گئی ہے نبیل کی نظروں سے گرانے کیلئے اور اس کے دل میں نفرت بھرنے کیلئے لیکن جب وہ بات سمجھی تو اسے غش ہی آ گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس پر ایسے دقیق الزامات بھی لگ سکتے ہیں اس دن شام سے یہی جھگڑا شروع ہوا تھا جو نبیل کے آنے کے بعد اس کے گھر والوں کی مہربانی سے مزید بڑھ گیا تھا۔ اور رات بھر نبیل نے اس کو طعنے اور الزامات دے دے کر ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ اپنی صفائی پیش کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ ایک طرف نبیل کے زبان کے نشتر تھے تو دوسری طرف ڈھائی سالہ شہزینہ کی طبیعت کی خرابی نے اسے پوری رات سونے نہ دیا۔ وہ صبح کیسے ہوئی تھی یہ صرف

لیلیٰ ہی جانتی تھی۔ صبح نبیل تو بک جھک کر دفتر چلا گیا لیکن لیلیٰ نے چار سالہ ولید کو اسکول نہ بھیجا اور گھر کے کام جیسے تیسے نبٹا کر ساس کو کہتی ہوئی ماں کے ہاں آ گئی اگر چہ ساس نے پیچھے اس پر بھی شور مچایا لیکن لیلیٰ کو لگتا تھا کہ اگر کچھ وقت اور یہاں گزرا تو وہ شاید ذہنی و جسمانی دباؤ مزید برداشت نہیں کر سکے گی اور بے ہوش ہو جائے گی یا اس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔

☆......☆......☆

ماں کے گھر آ کر اپنا دل ہلکا کر کے بھی وہ بے چین ہی تھی کہ نہ جانے اب اس کے پیچھے وہ لوگ کیا ہنگامہ کریں۔ لیکن ابھی وہاں خاموشی ہی تھی۔ میکا آ کر اگر چہ اسے اس ذہنی دباؤ سے تو نجات مل گئی تھی جو سسرال میں اس پر ہمہ وقت طاری رہتا تھا لیکن پھر بھی وہ مکمل طور پر پر سکون نہ تھی۔ آنے والا وقت اس کو عجیب قسم کے واہمہ دکھا رہا تھا۔

''بیٹا کیا سوچ رہی ہو؟'' امی نے چائے کا کپ لیلیٰ کو پکڑاتے ہوئے کہا اور لیلیٰ جو سوچوں میں گم تھی یکدم چونک سی گئی۔

''نہیں بس ویسے ہی۔'' لیلیٰ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''امی بچے کہاں ہیں۔'' وہ چائے کی پیالی کو میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

''باہر ہیں علینہ کے پاس۔ لیلیٰ بیٹا مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' امی کے چہرے پر بڑی خطرناک سنجیدگی تھی۔ لیلیٰ نے اپنی ویران آنکھیں ماں کے چہرے پر جما دیں۔ ''آج تمہیں یہاں آئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے'' امی کو اس کی آنکھوں سے کچھ خوف آیا تھا ''اور ابھی تک تمہارے سسرال والوں نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔''

لیلیٰ کیا کہتی سر جھکا کر رہ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ شاید اس میں بھی اسی کی کوئی غلطی ہو گی۔ بیٹا مجھے معلوم ہے کہ تم بہت پریشان ہو اور یقیناً تمہیں بھی نبیل یا اس کے گھر والوں کا انتظار ہو گا۔ لیکن تم خود دیکھ لو کہ وہ کیسے بے حس اور خود غرض لوگ ہیں۔ امی اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ کتنے ہی لمحے چپ چاپ سرک گئے تھے۔

''بیٹا چائے لو نا۔'' امی نے جیسے دوبارہ بات شروع کرنے کیلئے تمہید باندھنی شروع کی تھی وہ جو کچھ کہنا چاہ رہی تھیں اس کیلئے انہوں نے اپنے ذہن میں الفاظ ترتیب دیئے تھے۔ لیلیٰ نے امی کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہا اور یونہی سر جھکائے گم صم بیٹھی رہی۔ دونوں کی چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ امی نے اگر چہ لیلیٰ سے چائے کا کہا تھا لیکن ہاتھ کسی نے نہ لگایا تھا۔

''لیلیٰ'' امی نے لیلیٰ کو ایک دفعہ پھر متوجہ کیا جس کے جواب میں اس نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے ان کو دیکھا۔ ''بیٹا جب سے تم آئی ہو تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی ہوں تمہارا، تمہارے بچوں کا، ایک لمبی عمر پڑی ہے ابھی تمہارے سامنے۔ تمہارے بچوں کا مستقبل تم سے ہی جڑا ہے۔ ہمارے آج کے ایک فیصلے پر ہمارے ساتھ آنے والے کل کا انحصار ہو گا۔ گزشتہ پانچ سال تم نے اس گھر میں کیسے گزارے ہیں یہ مجھ سے زیادہ تو شاید کوئی نہیں جانتا۔ تم جس کرب سے گزری ہو اتنی ہی تکلیف میں نے بھی اٹھائی ہے تمہارا ہر آنسو میرے دل پر گرتا ہے۔ اور اب تم ایک نیا زخم سہہ رہی ہو اس نے تو مجھے بھی زخمی کر دیا ہے۔'' امی کہہ رہی تھیں اور لیلیٰ لب بھینچے سن رہی تھی۔ میں نے بہت سوچا اور تمہارے ابو سے بھی مشورہ کیا۔ عارف کے سامنے بھی ساری صورتحال ہے۔ میں نے اس کا یہی حل سوچا کہ...... امی نے کچھ توقف کیا کہ ہم تمہیں اس جہنم سے نجات دلا دیں۔ امی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ لیلیٰ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ماں کو متحیر نظروں سے دیکھا تھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا۔''

''یہی کہ بیٹا...... تم نبیل سے طلاق لے لو'' امی نے بڑی ہمت کر کے الفاظ ادا کیے تھے۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' لیلیٰ ابھی بھی بے یقین تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی جو کچھ اس نے سنا وہ اس کی ماں نے ہی کہا ہے۔

''ہاں میں وہی کہہ رہی ہوں جو کچھ تم سن رہی ہو۔ ہر روز اس دوزخ میں جلنے سے بہتر ہے کہ ایک ہی دفعہ ایک بڑا فیصلہ کرلیا جائے ہم لوگ اب مزید تمہیں اس تکلیف دہ حالات میں نہیں دیکھ سکتے۔ بہت برداشت کرلیا تم نے اور پھر یہ کوئی غیر شرعی کام تو نہیں۔''

''اس فیصلے میں کیا ابا بھی شامل ہیں۔'' لیلیٰ نے ماں کی بات میں جواب میں پوچھا بھی تو کیا...... امی ایک دم ٹھٹھک گئی تھیں۔

''نہیں تمہارے ابا تو...... لیکن بیٹا جب میاں بیوی میں نہیں نبھ رہی ہوتی تو پھر یہی راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ دل پر پتھر رکھ کر کیونکہ میں اب دیکھ رہی ہوں کہ نبیل اور اس کے گھر والوں نے تمہارے لئے مطمئن زندگی گزارنے کا ہر راستہ بند کر دیا ہے بلکہ شاید وہ یہی چاہتے ہی نہیں کہ تم وہاں رہو لہٰذا اب تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ......''

''امی میرے لئے کیا بہتر ہے کیا نہیں یہ میں زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں وہ لوگ نہیں چاہتے مجھے رکھنا تو کیا ہوا میں تو اسی گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ نبیل کے ساتھ اپنے بچوں کے باپ کے ساتھ'' وہ لمحہ بھر کیلئے رکی۔

لیلیٰ بیٹا......!!'' امی حیرانی سے اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

''جی امی...... میرے مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ میں نبیل سے طلاق لے کر آ جاؤں۔ اس کے بعد میرے خیال سے میرے مسئلوں میں اور اضافہ ہی ہو جائے گا میں مانتی ہوں کہ ان لوگوں کا رویہ میرے ساتھ بہت برا۔ بہت ناقابل برداشت ہے لیکن اس کے باوجود میرا گھر وہی ہے۔ میں ان کی باتوں سے جب بہت ڈپریس ہو جاتی ہوں تو وقتی طور پر ضرور تھک جاتی ہوں جیسے اس دن ہوا اور میں یہاں آ گئی۔ لیکن یہ وقتی ہی ہوتا ہے۔ مستقل نہیں میں نے غلطی کی کہ اگلے دن ہی مجھے واپس چلے جانا چاہیے تھا لیکن میں شاید ذہنی طور پر بہت تھک گئی تھی جبھی چاہتے ہوئے بھی نہ جا سکی۔''

''تو ان لوگوں کو دیکھا وہ کون سا تم کو پوچھ رہے ہیں۔'' امی غصہ سے میں آ گئی تھیں۔

لیلیٰ کی باتیں انہیں بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔

''امی وہ لوگ تو ہیں ہی ایسے یہ آپ اور میں اچھی طرح جانتے ہیں اور آپ یہی تو کہتی ہیں کہ حالات کبھی یکساں نہیں رہتے وقت کے ساتھ ان میں ضرور تبدیلی آتی ہے...... امی...... آپ نے ہی مجھے ہمیشہ امید کا جگنو دکھایا ہے اب آپ ہی مجھے انتہائی قدم اٹھانے کا کہہ رہی ہیں۔'' لیلیٰ نے ماں کو ملتجی نظروں سے دیکھا اور امی جواب میں بے بسی سے بیٹی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

''جس خدا نے میرے لئے یہ حالات بنائے ہیں وہی مجھے ان سے نکال بھی دے گا۔''

لیلیٰ کے لہجے میں حد درجہ یقین تھا۔ ''میں کل ہی گھر چلی جاؤں گی آپ پریشان نہ ہوں میں ٹھیک ہوں۔ اور گھر کے حالات بھی یقیناً ٹھیک ہونگے۔'' لیلیٰ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ و بشاشت لا کر ماں کو مطمئن کرتے ہوئے بولی۔

''میرا روم روم تمہارے لئے دعا گو ہے میری بچی......'' امی نے زیادہ بحث نہیں کی اور اسے لپٹا لیا تھا۔

ابا کو اس کے فیصلے کا علم ہوا تو ان کی آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو آ گئے تھے۔ ورنہ بیوی اور بیٹے کے آگے وہ بھی کچھ کچھ مجبور ہو رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے نبیل سے بات نہیں کی تھی اور نہ ہی نبیل نے ان سے کسی قسم کا رابطہ کیا تھا۔ اگلے دن ابا خود ہی لیلیٰ کو چھوڑنے جا رہے تھے۔ عارف بھی ساتھ تھا۔ ان کا ارادہ یہی تھا کہ وہیں نبیل اور اس کی ماں سے بات ہو جائے گی۔ اور جو غلط فہمیاں ہیں انہیں بھی دور کر دیا جائیگا۔

☆......☆......☆

نبیل کی والدہ حسب توقع بڑے روکھے لاتعلق اور خشک طریقے سے ملی تھیں۔

انہوں نے اگر چہ ابا کا لحاظ کرتے ہوئے زیادہ باتیں نہ بنائیں اور اپنے آپ کو بہت کچھ کہنے سے باز رکھا لیکن اس کے باوجود وہ بالواسطہ بہت کچھ کہنے سے چوکیں بھی نہیں لیلیٰ کی ایک نند بھی ماں کا ساتھ دیتی رہی۔نبیل بھی کئی دفعہ بلانے پر کمرے میں آیا وہ بھی کچھا کھڑا اکھڑا ہی رہا۔عارف یہ سب دیکھتا رہا اور ضبط کرتے ہوئے پہلو پر پہلو بدلتا رہا۔ابا اسے وعدہ کر کے لائے تھے کہ وہ کوئی بھی ایسی بات نہ کرے گا جس سے صورتحال بگڑے اور وہ بہر حال وعدہ کا پابند تھا۔جب ہی چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ابا نبیل سے بڑی نرمی خوشدلی اور خلوص سے بات کرتے رہے جس کا جواب وہ بے رخی اور لاتعلقی سے دیتا رہا۔آخر تھوڑی دیر بیٹھنے اور بات کو اپنے طور پر سلجھا کر ابا عارف کے ساتھ آ گئے۔آتے ہوئے وہ بیٹی کو گلے لگا کر اور بہت سی دعائیں دے کر آئے تھے۔

☆......☆......☆

اور یہ سب تو ہونا ہی تھا، لیلیٰ نے سوچا۔باپ بھائی کے جانے کے بعد ساس نندوں نے اسے جلی کٹی سنائی تھیں۔نبیل کا رویہ بھی اس کے ساتھ تلخی اور بیزاری لئے ہوئے تھا لیکن وہ صبر کرنے والی تھی اس نے ان حالات سے سمجھوتہ کیا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

وقت کا کام گزرنا ہے اور وہ گزر رہا تھا۔آج جب لیلیٰ پیچھے مڑ کر دیکھتی گزرے دس سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔اس کے جیٹھ کا دوسرے شہر تبادلہ ہو گیا تھا اور وہ بھی اپنی فیملی سمیت وہاں منتقل ہو گئے تھے۔دونوں نندوں کی آگے پیچھے شادیاں ہو گئی تھیں اور وہ اپنے گھر سدھاری تھیں۔ایک نند بیاہ کر باہر چلی گئی تھی اور دوسری کے سسرال والوں کو اس کا زیادہ میکہ آنا پسند نہ تھا جس کی وجہ سے وہ مہینہ میں ہی آتی اور ایک رات رہ کر چلی جاتی۔ساس اگر چہ اپنی روش پر قائم تھیں لیکن بیٹیوں کی شادی کے بعد اکیلی رہ گئی تھیں اور اب انہیں لیلیٰ پر ہی انحصار کرنا پڑتا۔پھر لیلیٰ کی صلح کل طبیعت کے باعث اب وہ یکطرفہ جھگڑوں سے بھی شاید تھک سی گئی تھیں۔اوپر سے اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دن سیڑھی اترتے جو پیر مڑا تو اس کا جھٹکا سیدھا کمر پر آیا جس کے نتیجے میں کمر کے نچلے حصے کے مہرے اپنی جگہ سے ہل گئے اور وہ بہتیرے علاج کے باوجود بستر سے لگ گئی تھیں۔سارا دن میں صرف اپنی ضرورت کیلئے ہی بمشکل اٹھتیں اور پھر لیٹ جاتیں۔اس معذوری نے ان کا سارا طمطراق ختم کر دیا تھا۔وہی گھر جہاں ہر وقت لیلیٰ کو اذیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا اب پرسکون ہو چکا تھا اور بچوں کی معصوم چہکاروں اور آوازوں سے گونجتا تھا۔پچھلے دس سالوں میں وہ دو اور مزید بچوں کی ماں بن چکی تھی۔نبیل کے رویے میں بھی آہستہ آہستہ غیر معمولی تبدیلی آ چکی تھی اب اس کی زندگی کا محور بیوی اور بچے تھے۔وہ ان لوگوں کی خوشی اور آرام کا خیال رکھتا۔بقول علینہ ''نبیل بھائی اب سدھر چکے ہیں اور ان کی گم شدہ عقل واپس آ گئی ہے''۔جس پر لیلیٰ اسے ایک چپت رسید کر دیتی۔

لیلیٰ نے ایک لمبی سانس بھری اگر اس دن وہ ماں کی محبت اور جذبات کے آگے مجبور ہو کر کوئی فیصلہ کر لیتی تو زندگی کی ان حقیقی خوشیوں سے محروم ہو جاتی۔خدا نے اسے واقعی صبر کا پھل دے دیا تھا۔اس نے گھڑی دیکھی بچوں کے سکول سے آنے کا وقت ہو گیا تھا اور بچے آتے ہی بھوک کا نعرہ لگاتے تھے۔آج اس نے نبیل اور بچوں کی پسند کا چائنیز پکایا تھا۔وہ کھانا لگانے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

نبیلہ شہزاد

خوف

موٹی غزالی آنکھیں، ستواں ناک، سفید گلابی رنگت والی بھولی بھالی صورت کی مالک سلویٰ دلہن بنی بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ دیکھنے والیاں پلک جھپکنا ہی بھول جاتیں کہ کیا یہ واقعی زمین ہی پر بسنے والی کوئی لڑکی ہے یا کوئی پرستان کی پری۔ کوئی دیکھنے والی ماشاءاللہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھتی اور کسی کی زبان سے دعا نکلتی کہ اللہ نصیب بھی اتنا ہی پیارا کرے جتنی پیاری خود ہے۔

سلویٰ کی ساس ثمینہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی اور اپنی بہو پر لوگوں کے تبصرے سن سن کر نہال ہو رہی تھی۔ نئی نویلی دلہن کی ساس کی یہی تو فتح ہوتی ہے کہ لوگ اس کی پسند کو سراہیں۔ کسی نے بھی ثمینہ کے انتخاب میں نقص نہ نکالا لوگ ثمینہ کو داد دیتے نہ تھک رہے تھے۔ خواتین کے مختلف قسم کے جملے کانوں میں پڑ رہے تھے۔

واہ بھئی ثمینہ بہو ڈھونڈنے میں تو تم نے کمال کر دیا۔ بھئی اب میرے غضنفر کے لئے بھی ایسی ہی پری ڈھونڈنی ہے۔

وقار کو بھی کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی۔ میں تو اسے کہوں گی اب یہ کام اپنی پھوپھو ثمینہ کے ذمہ لگائے، تم تو ماہر ہو اس کام میں۔

اپنے انتخاب کی تعریف میں ہونے والا ہر جملہ ثمینہ کے قد میں اضافہ کر دیتا۔ گولڈن کام کا بھاری بھر کم سوٹ پہنے سٹیج پہ بیٹھی سلویٰ سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ ہر مہمان خاتون سٹیج پر جا کر اپنی بساط کے مطابق دلہن کو تحفہ دے رہی تھی۔ اچانک دلہن کی دادی ساس ہاتھ میں مخملی ڈبہ پکڑے بڑے وقار سے اسٹیج کی طرف بڑھی، دعاؤں کے ساتھ پیار سے دلہن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سلویٰ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ سلویٰ مسلسل نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ دادی نے مخملی ڈبہ کھولا اور سونے کا پنج انگلہ نکال کر سلویٰ کے دائیں ہاتھ میں پہنا دیا۔ یہ قیمتی اور گرینڈ تحفہ دادی ساس یعنی سلویٰ کے شوہر صارم کی دادی کی طرف سے تھا۔

سلویٰ نے جب اپنا پنج انگلہ سے بھرا ہاتھ دیکھا تو اس کی رنگت پیلی پڑنے لگی۔ تھوڑی دیر سلویٰ کا وجود کانپا اور ایک ہلکی سی چیخ کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔ اردگرد بیٹھی عورتوں کی سانسیں سینوں میں ہی اٹک گئیں۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا! عورتیں سلویٰ کو سٹیج پر ہی لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں ملنے لگیں کوئی اس کے منہ پر ہلکے ہلکے پانی کے چھینٹے لگا رہی تھی۔

''یا اللہ یہ میری خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی۔''

غم اور بے قراری سے ثمینہ کی زبان سے یہ جملہ پھسلا تو کئی تعریف کرنے والی خواتین دل ہی دل میں شرمندہ ہوئیں کہ کہیں اُن کی ہی نظر نہ لگ گئی ہو۔ آناً فاناً یہ خبر مردانہ ہال کی طرف بھی پھیل گئی۔ جلدی سے صارم اور اس کے بھائی آئے اور ثمینہ اور اس کے بیٹے لمحوں میں سلویٰ کو ہسپتال لے گئے۔ سلویٰ کی میکہ فیملی پہنچنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ یہ دعوت ولیمہ جہاں تھوڑی دیر پہلے خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے ہر دل افسردہ ہو گیا اور سلامتی و خیریت کی دعائیں کرنے لگا۔

بروقت علاج معالجے سے سلویٰ کی طبیعت کافی سنبھل گئی۔ اتنی دیر میں میکے والے بھی شادی ہال میں پہنچ چکے تھے۔ انہیں جب صورتحال کا علم ہوا تو سلویٰ کے بھائی بھی ہسپتال آئے۔ کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر نے ضروری ہدایات اور دوائی کے نسخے کے ساتھ ڈسچارج کر دیا۔ واپسی پر ثمینہ نے صارم اور دوسرے لوگوں کو شادی ہال میں بھیج دیا تاکہ اپنی نگرانی میں مہمانوں کو کھانا کھلائیں اور خود سلویٰ کی امی اور سلویٰ کو لے کر گھر چلی گئیں۔

سلویٰ کی امی کے سامنے ثمینہ کو اپنا آپ مجرم سا لگ رہا تھا وہ باتوں باتوں میں زاہدہ کو اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

بہن میری پھول سی بچی کو نہ جانے کس بدنظر کی نظر لگ گئی۔ ہماری تو خوشیاں ادھوری رہ گئیں۔ صارم کی دادی نے سلویٰ کو تحفہ دینے کے لئے سونے کا پنج انگلہ بنوایا تھا، کہتی تھیں جتنی پیاری ہماری بہورانی ہے اتنا ہی قیمتی تحفہ بھی دوں گی۔

پنج انگلہ...... پنج انگلے کا نام سنتے ہی زاہدہ پریشان سی ہوگئی لیکن جلد ہی اس نے پریشانی کو چھپالیا۔

دعوت ولیمہ سے فارغ ہوکر صارم اور دیگر لوگ گھر آئے تو زاہدہ ثمینہ سے کہنے لگی۔

بہن اگر آپ اجازت دیں تو ہم دلہا دلہن کو ایک دو دن کے لئے اپنے ساتھ لے جائیں اور ادھر پنجاب میں تو یہ رسم بھی ہے۔

ہاں بہن آپ بھی اس نئے جوڑے کی والدہ ہیں جیسا چاہیں کریں۔ ثمینہ کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا وہ تو پہلے ہی زاہدہ کو خوش کرنے کے چکروں میں تھی۔

صارم کا بھی سسرال گھر میں خوب دل بہل گیا اور وہ جلد ہی سلویٰ کے بھائیوں میں گھل مل گیا۔ زاہدہ کو صارم سمجھدار اور بااخلاق محسوس ہوا۔ سو اس نے ساری بات صارم کے سامنے کھولنے کا فیصلہ کرلیا۔ دوسرے دن سہ پہر کی چائے سے فارغ ہونے کے بعد زاہدہ نے صارم کو اپنے پاس بٹھالیا اور کہنے لگی۔ ''صارم بیٹے اب تم سلویٰ کی زندگی بھر کے ہم سفر ہو لہٰذا میں چاہتی ہوں کہ اس کے بارے میں کوئی بھی بات تم سے پوشیدہ نہ رہے۔'' یہ کہہ کر زاہدہ نے لمبی گہری سانس لی اور دور خلاؤں میں گھورنے لگی جیسے ماضی کی دریچے سے کچھ کھوج رہی ہو، پھر گویا ہوئی۔

''یہ 2005ء کی بات ہے۔ میرا میکہ آزاد کشمیر میں ہے۔ پہاڑوں سے نیچے وادی میں میرے میکہ بنے گھر کے سامنے سے ٹھنڈے پانی کا نالہ گزرتا ہے۔ اردگرد دلکش مناظر ٹھنڈی ہوائیں، سرسبز ماحول یہ سب کچھ طلسماتی نظارے لگتے ہیں۔ بچے جولاہور کی حبس زدہ گرمی اور آلودہ فضا سے تنگ آئے ہوتے تھے گرمیوں کی چھٹیاں ہوتے ہی کشمیر جانے کی رٹ لگا دیتے۔ میں نے بھی سال بعد ہی میکے جانا ہوتا تھا اس لئے میں بچوں سے بھی پہلے تیار ہوتی۔ ہم چھٹیاں ہوتے ہی کشمیر کے لئے روانہ ہوجاتے پھر خوب مزے سے تقریباً اڑھائی ماہ تو ضرور ٹھنڈی ٹھنڈی آب و ہوا سے لطف اندوز ہوتے۔ لیکن 2005ء میں ابا جان کی طبیعت بہت خراب ہوگئی، ساتھ ہی گرنے کی وجہ سے کولہے کی ہڈی فریکچر ہوگئی۔ جس کی وجہ سے مجھے تقریباً ڈیڑھ ماہ مزید رکنا پڑا اور اکتوبر آن پہنچا۔

اکتوبر ہی کی ایک صبح زمین بھرگئی اور ہلنے لگی۔ چند ساعتوں بعد ہی ہر طرف سے چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ کئی پہاڑوں سے پتھر گرنے کی آوازیں ایسے آنے لگیں جیسے ہم گر رہے ہوں۔ ہمارا گھر تو محفوظ رہا لیکن کئی ملنے والے اور عزیز واقارب اس زلزلے کی نذر ہوگئے۔ زندہ بچ جانے والے پوری جانثاری کے ساتھ لاشیں نکالنے اور زخمیوں کی خدمت میں مصروف تھے لیکن جہاں فرشتہ صفت لوگ جمع ہوتے ہیں وہاں کہیں نہ کہیں سے شیطان صفت بھی آن ٹپکتے ہیں۔ ادھر بھی کئی ایسے لوگ حکومتی امداد سے پہلے ہی پہنچ گئے۔

ہمارے مرد حضرات اور بڑی عورتیں سب لوگوں کی مدد کے لئے پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے لیکن ہم کچھ خواتین بچے اور بوڑھے وادی میں ہی رہے۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے ہی ایک آدمی ہاتھ میں تھیلا پکڑے ڈھلوانی پہاڑ کے مشکل راستے پر چل رہا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا پاؤں پھسلا یا ٹھوکر لگی لیکن ساتھ ہی وہ پہاڑ سے نیچے وادی کی طرف لڑھکنا شروع ہوگیا اور آخر کار وہ نیچے وادی میں آگرا۔

ہم جلدی سے نالہ پار کرکے اس آدمی تک پہنچے لیکن جب نبض چیک کی تو بدقسمتی سے وہ آدمی فوت ہوچکا تھا کوئی جوان مرد تو ادھر موجود

نہ تھا۔ ہم پریشان ہو گئے کہ اب کیا کریں، اس کے مرنے کی کسے اطلاع کریں۔ سلویٰ ان دنوں تقریباً دس برس کی تھی۔ میں نے سلویٰ اور اپنی دو بھابیوں کو لاش کے پاس رکنے کو کہا اور خود بھاگ کر واپس گھر میں اس کا حل اپنے بیمار باپ سے پوچھنے آئی۔ چونکہ وہ آدمی شکلاً بھی غیر کشمیری لگ رہا تھا لہٰذا اس کی پہچان ہمارے لئے ممکن نہ تھی۔ ابا جی نے کہا تم لوگ اس کی جیبیں دیکھو شاید اس کا کوئی اتا پتہ نکل آئے۔ میں نے واپس آ کر ایسا ہی کیا، قمیض کی ساری جیبیں ٹٹول ماریں سوائے چند روپوں کے کچھ نہ نکلا۔ سوائے اس کے کوئی حل نہ تھا کہ وہ تھیلا کھول کر دیکھوں جو اس آدمی کے ساتھ نیچے گر گیا تھا۔ کہ شاید اس میں سے ہی کوئی ایسی چیز مل جائے جو اس کے وارث تلاش کرنے میں مددگار بن جائے۔

پریشان تو ہم سب تھے لیکن سلویٰ حساس ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی پریشان لگ رہی تھی۔ میں نے اپنی بھابھی کو تھیلا کھولنے کے لئے کہا۔ بھابھی نے تھیلے کی گرہ کھول کر تھیلا الٹا کر کے تھیلے کا سامان زمین پر ڈالا لیکن اگلے ہی لمحے ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔ سلویٰ کی رنگت یک دم پیلی پڑ گئی۔ دو چار خوفناک چیخیں مارنے کے بعد بے ہوش ہو گئی۔ وہاں زمین پر سونے چاندی کے زیورات پڑے تھے ساتھ ہی بازوؤں سے الگ کئے ہوئے گورے اور قدرے بھاری دو نسوانی ہاتھ پڑے تھے جس کی وجہ صاف سمجھ میں آ رہی تھی۔ ایک ہاتھ کی چار انگلیوں میں تنگ انگوٹھیاں تھیں اور دوسرے ہاتھ میں سونے کا پنج انگلہ تھا جسے اُتارنے کی نسبت کاٹنا شاید زیادہ آسان تھا۔

اب ہماری اس لاش سے ہمدردی ختم ہو چکی تھی۔ حیوانیت کا مظاہرہ کرنے والا وہ شخص اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ ہم نے سب کو وہیں چھوڑا اور سلویٰ کو اٹھا کر گھر آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد سلویٰ کو ہوش تو آ گیا لیکن جب بھی زیور سے بھرے ہاتھ دیکھتی ہے تو ضرور متاثر ہوتی ہے اور خوف کھاتی ہے۔ ہم نے ایک دو ڈاکٹروں کو بھی دکھایا اور کئی دم کرنے والوں سے دم بھی کروایا لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔''

''خالہ میں سلویٰ کا علاج کسی اچھے ماہر نفسیات سے کرواؤں گا مجھے امید ہے انشاء اللہ یہ ضرور ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن مجھے افسوس ہے ایسے لوگوں پر جو ایسے مواقع پر عبرت حاصل کرنے کی بجائے مزید سرکش بن جاتے ہیں اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے ہیں حالانکہ وہ اپنی زندگی کی مہلت سے بھی بے خبر ہوتے ہیں۔''

صارم کے تاسف بھرے اظہار خیال کی تائید میں زاہدہ نے بھی سر ہلایا۔

☆......☆......☆

اعجاز فاطمہ صدیقی

احساس

آج خلاف معمول کھانے کی اشتہا انگیز خوشبوؤں کی لپٹیں اڑ کر جب کمرے میں بیٹھی نفیسہ بیگم تک پہنچیں تو وہ حواس باختہ ہو کر کمرے سے باہر نکلیں اور کچن کا رُخ کیا۔

کچن کا منظر ان کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ کیا دیکھتی ہیں کہ بیٹے کی چہیتی بیوی یعنی ان کی بہو دو تین دیگچیاں چولھے پر چڑھائے کھانا پکانے میں مصروف ہیں، دو ماسیاں بھی مددگار کے طور پر ساتھ ہیں، آج چوپر، گرائنڈر کی قسمت بھی جاگ چکی تھی اور پریشر ککر بھی خوشی سے سیٹی بجا رہا تھا۔ بہو بیگم محویت کے اعلیٰ درجے پر فائز تھیں۔ ساس کے تفصیلی جائزے کی ذرا بھی بھنک ان کو نہ پڑی۔ یوں بھی جو کھانا آج وہ پکا رہی تھیں اس میں محنت کے ساتھ ساتھ محبت کا عرق ڈالنا نہایت ضروری تھا ورنہ کھانے میں ذائقہ کہاں سے آتا!

نفیسہ بیگم اپنی بہو کی جلالی طبیعت سے بخوبی واقف تھیں لہٰذا لاؤنج میں بیٹھ کر خاموشی سے سن گن لیتی رہیں، منہ سے کچھ نہ بولیں۔ نہ یہ پوچھا کہ کون آ رہا ہے، کس کی دعوت ہے۔ تمام سوال جواب اپنے ذہن میں ہی الجھاتی خاموشی سے بیٹھی تسبیح گھماتی رہیں۔

نفیسہ بیگم کو بہو گھر میں لائے اگرچہ کئی سال گزر چکے تھے لیکن گھر میں باقاعدگی سے کھانا پکتا کبھی دیکھا نہ تھا۔ پوری زندگی ماں کو نیند سے اٹھا اٹھا کر اپنی پسند کی چیزیں پکوا کر کھانے والا بیٹا بیوی کی نیند و آرام میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا آفس جا کر ناشتہ کیا جاتا جو گھر کی سوکھی ڈبل روٹی سے لاکھ درجہ بہتر ہوتا۔ بہو بیگم دو بجے اُٹھتیں، جوس، پھل اور مقویات سے باقاعدہ انصاف کرنے کے باوجود صبح کے وقت کچھ مخصوص جملے ان کی زبان سے جاری رہتے۔

ارے بھئی اب ناشتے کا ٹائم کس کے پاس ہے! اگر ہم بھی ٹوسٹ پر مایونیز لگا لگا کر کھائیں اور بیٹھ کر گرما گرم چائے نوش کریں تو یہ کمبخت ماسیوں سے کام کون کروائے۔ یہ برتن سنک میں پڑے ہیں، کپڑے الگ اُبل رہے ہیں، مٹی دھول ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ میں اکیلی جان اور اس پر ہزاروں کام......وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال انڈے پراٹھے، حلوہ پوری، چھولے ترکاری جو اس گھر کی خاص روایت تھی اب قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ اس کو یاد کر کے صرف خیالی مزہ ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ حقیقی لذت اٹھانا اس گھر میں تو ممکن نہ تھا۔

اب رہ گیا کھانے کا سوال! کھانا برگر، بروسٹ اور پیزا پر مشتمل ہوتا، کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کیلئے مصالحہ دار بریانی، حلیم اور نہاری بھی آرڈر کر دیئے جاتے اور اللہ اللہ خیر صلا۔ جب بہو بیگم کی صبح دو بجے ہوتی تو رات یعنی دو بجے ہی ہوتی یعنی رات کا کھانا بھی بارہ ایک بجے سے پہلے نہ ہوتا جبکہ نفیسہ بیگم علی الصبح نماز کیلئے بیدار ہوتیں، عبادت سے فراغت کے بعد چائے بنا کر ڈبل روٹی یا پاپے کھا کر شکرِ خدا کرتیں، ان کی دوپہر بھی دوپہر کو ہی ہو جاتی، ظہر کی نماز کے بعد کھانے کا معمول ہمیشہ سے تھا لیکن اب کھانے کے نام پر دلیہ، ڈبل روٹی اور دودھ، رات کا کھانا؟ رات کو تو وہ اکثر آنسو پی کر ہی سو جاتیں۔ آدھی رات کو شہد میں ڈوبی بہو بیگم کی آواز ان کی سماعت سے ٹکراتی تو وہ مجبوراً بیدار ہو جاتیں۔

''امی آپ بہت جلد سو جاتی ہیں، آپ کو معلوم تو ہے آپ کے بیٹے رات کو دیر سے آتے ہیں لہٰذا ذرا دیر ہو جاتی ہے۔'' اٹھلا اٹھلا کر کہتیں۔ ''امی اب اٹھ بھی جائیں دیکھئے کیسا گرما گرم پیزا تھا اب آپ

کے کھاتے کھاتے سخت ہو جائے گا۔'' اور واقعی جب وہ ہاتھ منہ دھو کر کھانے آتیں تو روکھا سوکھا پیزا ان کے حلق سے نہ اترتا۔ چپلی کباب ان کے دانتوں سے چبائے نہ جاتے، روٹی اور شوربہ دار سالن کھانے کی عادی جو تھیں بازار کا کھانا ٹھیک سے ہضم بھی نہ ہوتا۔

بہرحال کھانے کے اس بدتر نظام کے باعث وہ پریشان ہی رہتیں۔ خود ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ خود پکا کر کھالیں۔ کبھی اپنی ہمت کو مجتمع کر کے کچن کا رخ کرتیں تو ہر چیز کو بے سلیقہ اور بے ترتیب ہی پاتیں۔ کوئی چیز ڈھکانے پر نہ ملتی، ہلدی دکھائی دیتی نہ لہسن پسا ہوا ملتا، گرم مصالحہ پڑیوں میں ملتا، دالیں وغیرہ شاپرز ہی میں پڑی رہتیں، غرض تھیلوں اور پڑیوں میں سے ٹٹولنا انہیں ایک آنکھ نہ بھاتا۔ فرج کی طرف نگاہ کرتیں تو سبزیاں گلی سڑی ملتیں، گھر ماسیوں کے رحم و کرم پر چھوڑا جائے تو اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ غصے میں پھٹ پڑیں اور اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی ماریں، لہٰذا کچن میں سرسری طور پر آتیں اور دودھ ڈبل روٹی یا دودھ دلیہ کھا کر پیٹ بھر لیتیں۔ حالانکہ نفیسہ بیگم اعلیٰ ترین کھانا پکانے اور کھانے کی دلدادہ تھیں۔ موجودہ صورت حال ان کے لئے تکلیف دہ ضرور تھی لیکن وہ حالات کی سنگینی سے خوب واقف تھیں۔ اکثر دودھ ڈبل روٹی پر گزارہ کر کے انہوں نے کس طرح اپنی زبان کو ذائقے سے بے نیاز کر دیا تھا یہ وہی جانتی تھیں یا ان کا خدا۔ زندگی لشتم پشتم گزر رہی تھی۔ ڈبل روٹی کھا کر بھی وہ خدا کا شکر ہی کرتی تھیں کہ ڈبل روٹی تو رکھی مل جاتی ہے اگر یہ بھی نہ ملتی تو وہ کیا کر لیتیں!

ڈبل روٹی مہیا ہونے پر بھی ان کی بہو ہزار دفعہ جتاتے نہ تھکتیں۔ بڑا زور دے کر میاں سے کہتیں، سنیئے! یاد سے ڈبل روٹی رات کو ضرور لیتے آیئے گا، امی اذان کے وقت ناشتہ کرتی ہیں۔ یا نہایت لگاوٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتیں، امی میں نے ڈبل روٹی منگوا دی ہے، خالی چائے نہ پیا کریں ٹوسٹ پر جام یا مایونیز لگا کر کھایا کریں۔

بیٹا مسکرا کر بیوی سے گویا ہوتا، کتنا خوش قسمت ہوں میں جو تمہارے جیسی بیوی ملی ہے۔ میری امی کا کس قدر احساس کرتی ہو تم اور بیوی ہواؤں میں اڑنے لگتی۔

ایک ماہر سیاست دان اور اسٹار پلس کی بہو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بہو نے بڑی خوبصورتی سے بیٹے کو ماں سے دور اور خود سے قریب کر لیا تھا۔

بہرحال آج نفیسہ بیگم دل ہی دل میں بہت خوش تھیں اور اندازے لگا رہی تھیں کہ شاید قورمے کی خوشبو ہے یا تہہ دار بریانی کی مہک۔ خوشبو مزے دار ہے تو کھانا بھی ذائقہ دار ہی ہوگا۔ بسکٹ نگل نگل کر اور ڈبل روٹی ٹھونس ٹھونس کر ان کی بھوک جو مر چکی تھی، آج کچن سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبو کے باعث ایک دم سے چمک گئی۔

شام ہونے کو آئی۔ کسی کے آنے کی اطلاع بھی نہ ملی، اس لئے یہ بات تو طے تھی کہ یہ اہتمام گھر ہی کے لیے ہے۔ شاید کسی بچے کی سالگرہ ہو۔ لیکن سالگرہ تو باہر ہوٹلوں میں کی جاتی جہاں صرف سسرالی عزیزوں کا راج ہوتا۔ وہاں کے ہلے گلے میں ان کا وجود ویسے ہی غیر ضروری سمجھا جاتا تھا نہ ہی وہ خود وہاں جا کر اپنی عزت خاک میں ملانا چاہتی تھیں۔

عمر کا تقاضا تھا یا میٹھی میٹھی ڈبل روٹی کھائے ہوئے صبح کا پیٹ تھا جو دوہائی دے رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھیں کہ آج دل بھر کر کھاؤں گی، نہ بلڈ پریشر کا خیال کروں گی اور نہ بہو کے تیوروں کا۔ سوچوں کے تانے بانے بُن ہی رہی تھیں کہ ان کے بیٹے کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''کمال کرتی ہو بیگم تم بھی'' وہ لپکتی ہوئی لاؤنج میں آئیں جہاں سے کچن کی سرگرمیوں کو بغور دیکھا جا سکتا تھا۔

بیٹا بیوی سے کہہ رہا تھا۔ ''حد ہے تم اب بتا رہی ہو دوپہر کو فون کر دیتیں تو میں جلدی نکل آتا۔''

بیوی گویا ہوئی۔ ''میں نے سوچا ایک دو ڈشیں بنالوں اتنے میں آپ آفس سے آ جائیں گے لہٰذا ٹائم لگ گیا بہرحال اب کھانا تیار ہے۔''

ڈائننگ ٹیبل پر چار پانچ ہاٹ پاٹ اور بڑے باؤلز میں کھانا پیک رکھا تھا۔ بیٹے کی آواز آئی ''ارے جلدی تمام ڈبے گاڑی میں رکھو امی بے چاری بھوکی بیٹھی ہوں گی۔ ویسے تمہاری بھابھی کو میکے جا کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی، تمہارے بھائی کو کچھ اپنی ماں کا احساس ہے یا نہیں؟ اس عمر میں بے چاری کیا خود کھانا پکا کر کھائیں گی؟''

بیوی اٹھلا کر بولیں۔ ''میں نے دو تین دن کے کھانے کا بندوبست کر دیا ہے، جا کر فریز کر دوں گی نکال کر کھاتی رہیں گی۔''

آخری جملہ جس کو سن کر نفیسہ بیگم کاؤچ پر جیسے ڈھے سی گئیں ان کے بیٹے کا تھا'' کاش تمہاری امی کو بھی میری امی جیسی بہو ملتی تو......''

مزید جُملے سننے کی تاب نفیسہ بیگم میں نہ رہی تھی۔

☆......☆......☆

روبینہ اعجاز

ذرا سی غلطی

ہر چند کہ شب کی تاریکی ہر سو پھیل چکی تھی۔ مگر وہی مائرہ جو کہ پہلے ہر دم ہنستی مسکراتی خوش وخرم اور ارد گرد کے جھمیلوں سے آزاد رہنے والی لڑکی تھی نہایت مغموم بیٹھی تھی۔ نیند تو اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رہ رہ کر یہی خیال دماغ میں گردش کر رہا تھا کہ ایسی سنگین غلطی تو نہ تھی جس کی اسے ایسی سخت سزا دی جا رہی تھی۔ غلطی تو بڑے بڑے عقلمند لوگوں سے بھی سرزد ہوتی ہے اور اکثر نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔ زندگی میں اونچ نیچ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ اگر ہر کام ٹھیک ہوتا رہے تو دنیا ہی جنت نہ بن جائے!

دراصل آج اس کی شادی کی تیسری سالگرہ کا دن بھی تھا۔ نجانے پورے دن میں وہ کتنی ہی دفعہ اپنا موبائل اٹھا کر میسجز اور مِس کالز چیک کرتی رہی۔ کیا اس کا وفادار شوہر، اس کی نندیں جو اسے بہنوں جیسی عزیز تھیں، دیور بالکل چھوٹے بھائیوں جیسے، ساس سسر ماں باپ کے قائم مقام...... کسی کو اس دن کی یاد نہ آئی!

اب جبکہ رات کے ڈھائی بج چکے تھے ہر آس اور ہر امید ٹوٹ چکی تھی۔ زبردستی بستر پر لیٹ کر آنکھیں جو موندیں تو تین سال پہلے کے مناظر اس کے تصور میں گھوم گئے جبکہ اس نے میکے کی دہلیز پار کر کے سسرال میں قدم رکھا تھا۔ کتنا ہی پرجوش اس کا استقبال ہوا تھا۔ نہ صرف گھر والے بلکہ ان کے رشتہ داروں نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ ڈھیروں تحائف اور محبتیں پا کر تو وہ اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھ رہی تھی۔ پھر سب سے بڑھ کر اتنا اچھا، سمجھدار، پڑھا لکھا شوہر، لوگ سچ ہی تو کہہ رہے تھے کہ مائرہ تمہاری قسمت بہت اچھی ہے۔

پرخلوص محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے کہ انسان پرانا وقت اور سگے رشتوں تک کو بھول جاتا ہے یہی حال مائرہ کا تھا۔ جب میکہ سے کوئی لینے آتا یا اس کی ساس کہتیں، ارے بھئی مائرہ کیا اپنے ماں باپ کو بھول چکی ہو، جاؤ ذرا دو چار روز ان کے پاس تو رہ آؤ، تو اسے احساس ہوتا ہاں واقعی ایسا ہی تو ہوا ہے۔ پھر وہ میکے چند دن گزار کر آتی۔

اس دن بھی وہ امی کے ہاں آئی ہوئی تھی اور امی کا ہاتھ بٹانے کو کھیر پکا رہی تھی۔ شام کو اس کے شوہر کو اسے واپس لینے آنا تھا۔ اتنے میں اس کی کالج کی دوست کا فون آ گیا اور وہ چولہا چھوڑ چھاڑ کر فون پر مصروف ہو گئی۔

’’ارے واقعی سچ کتنا مزہ آئے گا تمہیں۔‘‘ مائرہ کہہ رہی تھی اس کی دوست اسلام آباد سیر وسیاحت کے لئے جا رہی تھی پھر ایک گھنٹہ کیسے گزرا پتہ ہی نہ چلا۔ واپس آئی تو امی کھیر میں چمچ چلا رہی تھیں ساتھ ساتھ مائرہ سے خفا بھی تھیں۔ ’’مائرہ اب تو یہ لمبی لمبی باتیں چھوڑو، ذمہ داریاں قبول کرو۔‘‘

’’امی آپ کو پتہ ہے میں اپنے سسرال میں کتنے کام کرتی ہوں اور پھر میرے پکائے ہوئے کھانوں کو تو لوگ انگلیاں چاٹ چاٹ کر کھاتے ہیں۔‘‘

ابھی مائرہ کی شادی کو ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے آنگن میں خوبصورت، تندرست بیٹے کی صورت میں ایک پھول کھلایا۔ پھول بھی ایسا جس کی خوشبو نے پورے گھر کو معطر کر دیا۔ ہر کوئی بچے کی طرف کھنچا چلا آتا کہ کب سویا کب جاگا اور کب رویا اور کیوں رویا۔ بس مائرہ بھی کبھی پریشان سی ہو جاتی کہ بھئی بچہ ہے روئے گا تو ضرور۔

وقت تو گزرتا ہے لیکن اچھے اور مصروف وقت کو تو پَر لگ جاتے ہیں۔ مائرہ کو پتہ ہی نہ لگا اور بیٹا ایک سال کا ہونے کو آ گیا۔ گھر بھر نے بڑی دھوم دھام سے سالگرہ منانے کا پروگرام بنایا۔ ہر کوئی تیاریوں میں مصروف تھا۔ سالگرہ کا انتظام ایک شادی لان میں کیا گیا۔ دل کھول کر سب نے اپنے دوستوں، رشتہ داروں کو مدعو کیا۔ مائرہ کا شوہر تو سالگرہ سے ایک دن پہلے کافی فکر مند تھا کہ اس تقریب میں تو مجھے ولیمہ سے زیادہ رقم خرچ کرنی پڑ رہی ہے، پھر سب کی تیاریاں الگ، ساری جمع پونجی نکل چکی ہے۔ مائرہ نے کہا بس پہلی سالگرہ ہے اچھی طرح منا لیتے ہیں پھر سادگی سے گھر میں ہی کرلیا کریں گے۔

سالگرہ والے دن مائرہ اپنے کپڑے استری کرنے لگی تو اسے ایک فینسی بٹن ڈھیلا نظر آیا۔ جلدی سے سوئی میں دھاگہ ڈالا اور بٹن کو مضبوطی سے ٹانکنے لگی۔ اتنے میں اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی اور بجتی ہی گئی۔ قمیض کو کارپٹ پر ڈال کر فون اٹھایا تو پتہ چلا اس کی قریبی دوست کا تھا جس کی اب شادی ہونے جا رہی تھی۔ باتوں باتوں میں اسے پتہ ہی نہ لگ سکا کہ کب اس کا بیٹا کمرے کے اندر آیا بس ایک زوردار چیخ سے وہ ہڑبڑا کر بھاگی۔ نظروں پر یقین نہ آیا کر بچہ قمیض پر لگی سوئی پر جا گرا ہے۔ سوئی اس کے پیر کے اندر آدھی ٹوٹ کر چلی گئی تھی۔ بھاگم بھاگ دو تین قریبی کلینکس پر لے گئے مگر سب نے انکار کیا کہ بڑے ہسپتال لے کر جائیں۔

آخر بڑے ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ بڑا آپریشن کرنا ہو گا کوئی یقینی بات نہیں کر سکتے۔ آپریشن شروع ہوا۔ امی اور ساس تو تسبیح لے کر بیٹھ گئیں، نندیں اور بہنیں سورتیں پڑھتی رہیں۔ دیور اور شوہر تو ٹہل ٹہل کر نجانے کتنے میلوں کا سفر طے کر چکے تھے۔ مائرہ سے تو دعا کے الفاظ بھی نہیں نکل پا رہے تھے، اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ بس مختلف آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھیں کہ بھئی! چھوٹے بچوں کا تو بہت خیال کرنا ہوتا ہے۔ ان پر تو ہر وقت نظر رکھی جاتی ہے۔

خاندان کے دیگر افراد بھی پہنچ چکے تھے۔ خالہ ساس نے روتی ہوئی مائرہ کو تسلی تو نہ دی بس اپنا ماضی یاد کرنا شروع کر دیا کہ میرے بھی چھوٹے چھوٹے چار بچے تھے، اس پر سلائی کڑھائی بھی خوب کی، مگر سوئی تو بچوں کی پہنچ سے بہت دور بلکہ اتنی اونچائی پر رکھی جاتی کہ بچوں کے ہاتھ نہ لگ پائے۔

خیر قیامت خیز چار گھنٹے گزرے، سب کی دعائیں رنگ لائیں اور ڈاکٹروں نے آپریشن تھیٹر سے باہر آ کر یہ نوید مسرت سنائی کہ آپریشن کامیاب ہوا ہے، سوئی ایک جگہ ہڈی کے پاس جا کر اٹک گئی تھی، لیکن ابھی چار پانچ روز ہسپتال میں بچے کو داخل رکھنا ہوگا۔

پانچ روز بعد بچہ خیر و عافیت سے گھر واپس آیا۔ مائرہ تھکن اور شرمندگی سے پہلے ہی چور چور تھی، اس کے شوہر نے آتے ہی ساتھ ہسپتال کا بل مائرہ کے آگے کر دیا کہ اپنے زیور بیچو یا قرض لو، یہ لاکھوں کا بل میرے بس کا نہیں۔ مائرہ نے بھی دوٹوک جواب دیا کہ قرض خود ہی لو میں نہیں جانتی۔

بات بڑھی اور اتنی بڑھی کہ رات کو مائرہ کو اس کے میکے چھوڑ دیا گیا۔ نہ اِدھر سے کوئی بات ہوئی نہ اُدھر سے کہ ایک سال گزر گیا۔ مشکل وقت بہت لمبا ہوتا ہے۔ مائرہ کو یہ سال کسی صدی سے کم نہیں لگا۔ مائرہ کی امی جہاندیدہ خاتون تھیں شادی کا تیسرا سال چڑھا تو دوسرے دن ہی فون کر کے اس کے شوہر کو بلوایا اور خود مائرہ اور بچے کو روانہ کیا کہ غلطی تو مائرہ کی تھی مگر ضد میں آپ لوگ آ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ تو معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اور مائرہ کو تو ماں کی کہی ہوئی بات اب اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ فون تو تھوڑی اور ضروری بات کے لئے ہوتے ہیں، لمبی لمبی باتیں نہ صرف وقت کا ضیاع ہیں بلکہ بڑی مصیبت بھی بن جاتی ہیں۔

☆......☆......☆

غافر شہزاد

ایک اور قصہ چہار درویش

وہ چار تھے اور پانچوں ان کا مرشد، اپنے مرشد کی ہر بات مانتے، مریدی اور پیری کا یہ سلسلہ کئی سالوں سے چل رہا تھا۔ یوں تو مرشد کے دائرہ ارادت میں بیٹھنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی مگر ان میں سے چند ہزار ایسے تھے جن کو مرشد کی قدم بوسی کا اعزاز حاصل تھا اور چند ہزار میں سے چند سو ایسے تھے جن کے ساتھ مرشد نے گفتگو کی تھی۔ مرشد کا لب ولہجہ، الفاظ کا تاثر، معنی ومفہوم کی پرتیں اور مرشد کی رعب دار نگاہ کہ جس نے ان کی دنیا بدل دی تھی اور وہ اپنے اپنے علاقوں میں مرشد کی باتیں اور ان کی معنویت پر سوچ بچار کرتے اور انہوں نے اس سفر میں کئی منزلیں پالی تھیں۔ ان چند سو میں سے چند درجن ایسے تھے جن کا ہاتھ مرشد نے اپنے ہاتھوں میں لے کر ان کی دھڑکنوں کے زیر وبم کو اپنے اختیار میں کرتے ہوئے ایک ترتیب اور ردھم عطا کیا تھا، اب ان کی اور مرشد کی دھڑکن ہم آہنگ تھی اور ان چند درجن میں سے بھی دو چار ایسے تھے کہ جو مرشد کی محفل میں بیٹھے تھے جنھوں نے مرشد کی باتیں سنی تھیں۔ مختلف معاملات پر مرشد کی رائے اور مسائل کے حل کیلئے مرشد کا نقطہ ان پر ایسے کھلا تھا کہ ان کے اور مرشد کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا تھا، کبھی کبھی تو یوں لگتا گویا مرشد کی روح ان میں حلول کر گئی ہے۔ مرشد کے دائرہ ارادت میں آنے والے لوگوں کی رائے تھی کہ ان چاروں کے چہرے، گفتگو کا انداز، چال ڈھال سب کچھ مرشد سے اتنا مشابہ تھا کہ بعض اوقات پہلی نظر میں ان پر مرشد کا گماں ہوتا تھا مگر اگلے لمحے معلوم ہوتا کہ نہیں، کچھ کہیں تھوڑی سی کمی ہے۔ مرشد اس کمی کو ہلکا سا محسوس تو کر سکتے تھے مگر معلوم نہیں کر پاتے تھے۔ اگر چہ چاروں کے خدوخال ایک دوسرے سے جداگانہ اور منفرد تھے مگر مریدین کا خیال تھا کہ ایک کی لال گلاب آنکھیں مرشد کے جیسی نظر آتی تھیں۔ دوسرے کے بارے میں لوگ کہتے، اس کا لہجہ، گفتگو کا انداز، جملوں کی ساخت بالکل مرشد کی طرح ہے۔ تیسرے کے بارے میں اکثریت کی رائے تھی کہ اس کے عصا اور پگڑی کا انداز بالکل گویا مرشد کا انداز تھا، چلتے ہوئے جب وہ عصا کو گھماتا، گویا مرشد کا ڈپلیکیٹ نظر آتا اور چوتھے کا قد کاٹھ، کاندھوں کی ساخت اور ہاتھوں کی انگلیاں، اگر منہ چھپایا ہو تو بالکل معلوم نہ ہو پاتا کہ یہ مرشد خود ہیں یا وہ چوتھا خاص مرید۔ گویا مرشد کی شخصیت اپنی جسمانی اور روحانی جہات میں ان چاروں میں منقسم ہو گئی تھی۔ مرشد کی کوئی خانقاہ نہ تھی اور نہ ہی وہ گوشہ نشین تھا، نہ ہی اس کا حلیہ کوئی ایسا درویشوں والا تھا کہ لوگ اسے دیکھ کر دور سے عقیدت کے ساتھ جھک جائیں۔ دنیا بھر کے عام انسانوں کی طرح کوئی ظاہر تخصیص نہ تھی، بس یہ تو باطن تھا جہاں حقیقت اور معرفت کے گل وگلزار کھلے ہوئے تھے جو ایک بار باطن میں جھانک لیتا، وہیں کا ہو کر رہ جاتا۔ یہ چاروں مرشد کے سفر کی کئی منزلوں کے ہمرکاب تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ چاروں کی ارادت مندی بڑھتی چلی گئی۔ جسمانی طور پر باہم سینکڑوں کلومیٹر کا فاصلہ بھی ہوتا تو روحانی سطح پر ایسی قربتیں تھیں کہ الگ ہونے کا گماں بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہر بار مرشد کو دریافت کرتے مگر اگلی بار پھر ایک نئی منزل، نئی جہت، نیا پہلو مرشد کا ان کے سامنے ہویدا ہوتا اور وہ اس کو آشکار کرنے میں جت جاتے۔

چاروں کو ایک ہی وقت میں معلوم ہوا اور یہ انکشاف ان کیلئے کسی نیوٹران بم سے کم نہ تھا۔ چاروں ایک ہی وقت میں اٹھے اور اپنے اپنے گھر ٹی وی لاؤنج میں اپنے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ بیٹھ کر ٹیلی

ویژن دیکھنے پہنچے تھے۔ یہ ٹیلی ویژن کا ایک بہت ہی مقبول پروگرام تھا جس کو دیکھنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی اور دنیا بھر کے درجنوں مما لک جہاں جہاں اس زبان کو سمجھنے والے لوگ تھے، یہ پروگرام نہایت مقبول تھا۔ چاروں ٹیلی ویژن کے سامنے جب بیٹھے، اس وقت پروگرام کا میزبان ابتدائی کلمات سے پروگرام کا آغاز کر رہا تھا۔ چاروں نے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر ایک ہی وقت میں مرشد کو ٹیلی ویژن اسکرین پر دیکھا۔ مرشد اس پروگرام کے سامعین میں نہیں بلکہ پروگرام کے بنیادی کرداروں میں سے ایک کردار کی حیثیت سے بیٹھے تھے۔ چاروں نے مرشد کا یہ روپ پہلی بار دیکھا۔ اسکرین پر جب ان کی جھلک نظر آتی، چاروں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مرشد کو دیکھتے اور دل سے گواہی کے طلبگار ہوتے۔ شاید ایک بار ہی دل کہہ دے، یہ مرشد نہیں، کوئی اور ہے مگر دل جو سچائی کا خوگر ہو چکا تھا، ہر بار کہتا، یہ مرشد ہی ہیں۔ ہر بار جب مرشد کی جھلک نظر آئی، وہ نامعلوم حیرتوں کے سمندر میں ڈوبتے چلے جاتے۔ یہ سارا معاملہ ان کی فہم وفراست سے بالا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں تھا، پروگرام چونکہ طنز ومزاح اور جگت بازی کا تھا، لہٰذا وہاں پروگرام میں بیٹھے ہوئے جگت باز نہایت دیدہ دلیری اور بے خوف ہو کر بیچ بیچ میں موقع ملنے پر دیگر لوگوں کے ساتھ مرشد پر بھی جملے کس رہے تھے۔ چاروں کے گھر کے افراد اپنے اپنے گھروں میں ان کی موجودگی میں اس پروگرام میں پیش کی جانیوالی جگتوں پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ چاروں ایک عجیب مخمصے میں پڑ گئے۔ گھر والوں کو تو علم نہیں تھا کہ ان چاروں کا اپنے مرشد کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ وہ ان کو ایک اچھا باپ، اچھا بیٹا، ذمہ دار خاوند اور محبت کرنے والا بھائی سمجھتے تھے۔ وہ چاروں اپنے اپنے دائرہ کار میں اپنے فرائض بخوبی نبھا رہے تھے۔ چاروں ہی روزگار کے مختلف سلسلوں سے وابستہ تھے۔ ایک سرکاری افسر، دوسرا ماہر فن تعمیر، تیسرا پائلٹ اور چوتھا کالم نگار تھا۔ سرکاری افسر کی ایمانداری، فرض شناسی اور ذمہ داری کا بہت شہرہ تھا، بیوروکریسی میں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ زندگی کے سفر میں اگر غیر معمولی کامیابی حاصل نہ کی تھی تو ایسا نظر انداز بھی نہیں کیا گیا تھا۔ ماہر فن تعمیر ملکی اور عالمی سطح پر کئی ایک خوبصورت عمارت کے ڈیزائن کر چکا تھا۔ اس نے ایک جانب جدید فن تعمیر کے شاہکار بنائے تھے اور دوسری جانب عالمی سطح پر اسلامی فن تعمیر کے انداز میں بنائی جانے والی عمارت پر اس کو آغا خان کلچرل سروسز کی طرف سے بہترین عمارت کا ایوارڈ بھی مل چکا تھا۔ ہر دور حکومت میں وہ وزرائے اعظم اور صدور کی آنکھ کا تارہ رہا تھا۔ تیسرا ہوائی فوج میں پائلٹ تھا۔ سرحدوں کی حفاظت اپنے ایمان کی طرح کرتا۔ انتہائی سے انتہائی مشکل مہم کو کامیابی سے سر کر کے آیا تھا۔ جہاز یوں اڑاتا گویا خود اڑ رہا ہے۔ چوتھا اور آخری کالم نگار، ایک بہت بڑے اخبار کا مقبول ترین کالم نگار، آغاز شاعری سے کیا، پھر افسانے لکھے، سفر نامہ بھی لکھا مگر سب چھوڑ چھاڑ کر کالم نگاری کا ہی ہو کر رہ گیا۔ حکومتوں کو بنانے اور گرانے میں اس کے لفظ اور جملے کسی ڈرون حملے سے کم نہ تھے۔

چاروں نے وہ پروگرام اپنے اپنے گھروں میں ایک ہی وقت میں دیکھا تھا۔ یہ پہلا پروگرام نہیں تھا۔ گھر والوں نے ان کو بتایا کہ یہ پروگرام تو کئی ہفتوں سے آن ائیر ہے۔ چاروں نے ایک ہی وقت میں انگشت شہادت اٹھا کر مرشد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا اور وہ کردار...... چاروں گھروں سے ایک ہی وقت میں آواز سنائی دی، وہ ماسٹر جی ہیں، جب جگت باز ان پر جگت لگاتے ہیں تو یہ تلملا کر رہ جاتے ہیں مگر ہمیں بڑا مزہ آتا ہے۔ کبھی کبھی ان کے چہرے سے شانتی ٹپکتی اور کبھی کبھی زیرلب مسکرا دیتے ہیں مگر جب سے ان کو پروگرام میں شامل کیا گیا ہے، پروگرام کا مزہ دوچند ہو گیا ہے۔ اپنے اپنے گھر کے افراد سے کم وبیش ایسے ہی جملے سن کر چاروں کبھی تلملائے، کبھی زیرلب مسکرائے اور کبھی ان کے چہروں پر شانتی ابھری، چاروں نے پروگرام کو مکمل طور پر دیکھا اور اپنے اپنے بیڈروم میں اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ آج یہ بستر نہ تھے حیرتوں کے سمندر تھے، طلسمات کے پہاڑ تھے، دھندلکوں کے

بادل تھے، بے یقینی کے عفریت تھے۔ مجوبیت کے کمبل تھے جن کو اوڑھ کو وہ گہرے اندھیروں میں سو گئے کہ جہاں روشنی کی کوئی کرن نہ پہنچتی تھی۔

اگلی صبح چاروں ایک ساتھ مرشد کے آستانے پر پہنچے، یکبارگی ان کے ہاتھوں نے مرشد کے حجرے کے دروازے پر دستک دی اور داخل ہونے کیلئے اجازت کے طلبگار ہوئے۔ مرشد کی ایک ہاں چاروں کو اپنی اپنی جگہ ایک ہاں ہی لگی، چاروں دوزانو مرشد کے سامنے چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں استفسار تھا مگر آنکھیں اوپر اٹھانے کی ہمت نہ جتا پا رہے تھے۔ نظریں نیچی، دلوں کا دل کے ساتھ باہمی ربط قائم تھا مگر عقدہ نہیں کھل رہا تھا۔ مرشد نے ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کو کہا، حجرے میں ایک لمبی چپ اور بقول منیر نیازی تیز ہوا کا شور، یہ تیز ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی کھڑکی کے باہر سے گزر رہی تھی مگر یہ شور چاروں کے اندر ان کی سماعتوں کو گنگ کیے ہوئے تھا۔ وہ کوئی ایک لمحہ تھا جو پھیل کر صدیوں پر محیط ہو گیا تھا۔ ایک ہی وقت میں چاروں اٹھے تو انہیں لگا وہ اپنی زندگی کا ایک چوتھائی حصہ یہاں گزار کر جا رہے ہیں، باہر نکلے تو یوں لگا ابھی دروازے کی زنجیر ہل رہی ہے۔ بغیر کچھ کہے سنے، چاروں اپنی اپنی منزلوں کی جانب رواں ہوئے۔ چاروں کو ایک ہی اشارہ ملا، پھر آنا، ابھی وقت نہیں۔ جاؤ، معلوم کرو، کھوجو، حکمت و دانائی کے موتی خیرات میں نہیں ملتے، خود تہہ میں اترنا پڑتا ہے۔ آخر پانی کا قطرہ بھی تو کئی دہائیاں صدف کے اندر قید رہ کر موتی بنتا ہے۔ تمہارے گھر تمہارے صدف ہیں، تم صدف میں پانی کے قطرے کی مانند ہو، اگلا سفر خود طے کرو۔

اس دن کے بعد چاروں نے ٹیلی ویژن کا وہ پروگرام مسلسل دیکھنا شروع کر دیا۔ چاروں کا خیال تھا یہیں سے کوئی عقدہ کھلے گا۔ چاروں کے گھر والے خوش تھے کہ ان کے گھرانے کے سربراہ نے ٹی وی لاؤنج میں فیملی کے ساتھ بیٹھنا شروع کر دیا ہے۔ ان کے درمیان گفتگو کا آغاز ہوا ہے۔ ان کے بیچ میں خاموشی کی فصیل گرنے لگی ہے اور ان کے چہروں پر ہونے والی تبدیلیوں کو وہ محسوس کرنے لگے ہیں مگر چاروں درویش ہر پروگرام بغور دیکھتے، کبھی دھیان کسی جانب لے جاتا، کبھی سفر کی منزلوں کی کوئی اور سمت نکلتی۔ کبھی واپسی ہو جاتی، کبھی افقی، کبھی عمودی گویا سفر کے زاویئے بدلتے رہے۔ دل و دماغ کا ہیجان ان کی توجہ کسی ایک نقطہ پر مرکوز نہ ہونے دیتا۔ پروگرام کا کمپیئر نہایت اعتماد سے پروگرام کے سارے کردار کو پتلی تماشے کی طرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر باندھے، دھاگوں کی مدد سے نچاتا رہتا۔ ان انگلیوں میں ایک انگلی پر مرشد کی نکیل کا دھاگا بھی بندھا ہوا نظر آتا اور مرشد اس نچانے والے کی انگلیوں کے مختلف زاویوں پر گھمانے سے ناچتے رہتے۔ چاروں کیلئے انتہائی تکلیف دہ تجربہ تھا۔ پروگرام تو ہفتہ میں ایک بار چلتا مگر وہ باقی چھ دن بھی اس کی اذیت میں رہتے ہیں۔ وہ ابھی تک بیرونی ملازمت کی زد میں تھے۔ اپنے مرشد کو اس حال میں دیکھ کر وہ ساری صورتحال پر ملامت کرتے تھے۔ بیرونی ملامت سے اندرونی ملامت تک کے سفر میں ان کو کئی ہفتے لگ گئے مگر ملامت کے اس تجربہ سے گزر کر رہی ان پر آشکار ہوا۔ جب ایک بار آشکار ہو گیا تو پل پل اذیت ناک تھا۔ وہ اس اذیت میں جلتے تھے اور دن بھر جلتے تھے۔ ایک ایک لمحہ پھیل کر صدیوں پر محیط ہو جاتا تھا مگر سچ ان پر کھل چکا تھا۔ دن کے اوقات میں سرکاری افسر کو محسوس ہوتا اس کی دن بھر کی حرکات وسکنات کی ڈوری اس کے افسران بالا کی انگلیوں سے بندھی ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، ان ڈوریوں کے ہلانے سے کرتا ہے، اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہے۔ سب کچھ افسران بالا طے کرتے ہیں بالکل ایسے ہی جیسے اپنے ماتحت کیلئے وہ خود طے کرتا ہے کہ کس وقت کس نے کیا کرنا ہے۔ اس کی انگلیوں پر بندھے غیر مرئی دھاگوں کے اشاروں پر ماتحت ناچتے ہیں، اور وہ افسران بالا کی انگلیوں پر بندھے غیر مرئی دھاگوں کے کھینچنے پر ناچتا ہے۔ اب یہ دھاگے غیر مرئی نہ رہے تھے۔ ایک زنجیر تھی جس سے وہ بندھا تھا، غلام ابن غلام ابن غلام ابن غلام۔

ماہرفن تعمیر پر اپنا آپ آشکار ہوا۔ اس کو یوں لگا اس کی خوبصورت تخلیق کردہ صلاحیتوں کا اعجاز نہ تھیں بلکہ قادر مطلق طاقتوں نے جو کہا اس نے ڈیزائن کیا۔ انہوں نے چاہا جدید فن تعمیر کی جمالیات کیلئے عمارات ڈیزائن کی جائیں، اس نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے چاہا اسلامی فن تعمیر کی شباہت میں عمارتوں کی جمالیات کو پیش کیا جائے، اس نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے کہا کہ کمرشل عمارتیں بنائی جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جاسکے، وہ ان کیلئے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے والا بن گیا، گویا وہ خود کچھ نہ تھا۔ سب کچھ وہ تھے۔ اپنے باطن کا یہ چہرہ اس نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ آج تک اس کا خیال تھا کہ وہ آزادی سے تخلیقی عمل میں مصروف ہے مگر اب معلوم ہوا کہ وہ غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر خود کو ان کی ضروریات اور تقاضوں میں ڈھال لیتا ہے۔ اس لئے اسے یوں لگتا ہے جیسے وہ یہ سب کچھ اپنی مرضی سے کر رہا ہے مگر حقیقت یہ نہ تھی۔

ہواؤں میں جہاز کو اپنی مرضی سے اڑائے پھرنے والے پائلٹ کو پروگرام میں اپنے مرشد اور اینکر پرسن کے باہمی ربط کو دیکھ کر یوں لگا وہ تو غلام فضاؤں میں اڑتا ہے۔ اس کے بازو بھی اس کے اپنے مطیع نہیں تھے۔ بلکہ یہ بازو تو جہاز کے کل پرزوں کے مطیع تھے اور جہاز کے کل پرزے جہاز کے مالکوں کے اشاروں پر پرواز کھولتے، کہاں بم گرانے ہیں کہاں پھول، کہاں کھانے کے پیکٹ گرانے ہیں، کہاں قادر مطلق لوگوں کے جسمانی بوجھ کو کاندھوں پر اٹھا کر لے جانا ہے، یہ سب فیصلے اس کے اپنے نہیں ہوتے تھے۔ وہ تو محض ایسا کرنے پر پابند تھا۔ جنگوں میں کہاں آگ کا دریا بچھانا ہے، سیلابوں میں کہاں کمبل اور آٹے کے تھیلے پہنچانے ہیں، کون سے ملکوں کے کن ہوٹلوں میں لوگوں کو عیاشی کیلئے لے کر جانا ہے، یہ سب اس کے اختیار میں نہیں۔ وہ تو پتلی تماشے کا ایک کردار ہے۔

کالم نگار کی ذہنی اذیت تو سب سے دوچند تھی۔ اس نے تخلیقی سفر کا آغاز شاعر کے طور پر کیا تھا۔ دل کے لطیف اور کامل جذبوں کو اظہار کی شکل عطا کر کے اسے لگتا گویا اس کے باطن کا اظہار ہو گیا ہے اور لوگ یہی سمجھتے کہ یہ ان کے ہی جذبات کی لفظی اشکال ہیں۔ افسانے لکھے تو گویا معاشرے کے سارے دکھ اپنے دکھ بنا کر پیش کر دیئے۔ لہٰذا بہت کم عرصہ میں اس کے قارئین کی تعداد ہزاروں تک پہنچی۔ پھر اس نے کالم نگاری کے پیشے کو اپنایا۔ شاعری اور افسانہ نگاری پیٹ بھرنے کیلئے رزق کا وسیلہ نہیں بنتی۔ اس لئے اس نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا سودا کر لیا۔ وہ کچھ لکھنے لگا جو اس کے اخبار کا سیٹھ چاہتا تھا یا جو حکومت وقت کی منشا تھی۔ مگر یہ سب وہ غیر شعوری طور پر کر رہا تھا۔ اخبار کے دفتر کے ماحول اور حکومتی ایوانوں میں سرکردہ سیاسی رہنماؤں میں اٹھتے بیٹھتے وہ زندگی اور عوام کو ان کی آنکھ سے دیکھنے لگ گیا تھا۔ کبھی کبھی اس کی اپنی بات، اپنا جملہ کالم میں آجاتا تو وہ اکثر تدوین کی نذر ہو جاتا۔ ایڈیٹر کی نگاہ میں وہ جملہ اس پوری تحریر میں فٹ نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ جملہ لکھ کر خود تو اطمینان حاصل کر لیتا مگر وہ جملہ قارئین تک نہ جا پاتا اور اس کو اتنی فرصت نہ تھی کہ شائع ہونے کے بعد اپنے کالم کو خود باریک بینی سے پڑھتا۔ مرشد کو ٹیلی ویژن پروگرام میں دیکھ کر اس نے پہلی مرتبہ خود کو ان کی جگہ رکھ کر دیکھا۔ اپنے وجود سے باہر نکل کر اپنی کرسی، میز، قلم، دوات، الفاظ اور اخبار کے صفحات کو دیکھا۔ گویا اس تجربہ میں تطہیر کے پورے عمل سے گزرا تو اسے معلوم ہوا کہ کئی درجن کالموں کی بیسٹ سیلر کتابیں شائع کرنے کے باوجود وہ، وہ نہیں لکھ سکا جس کو لکھنے کا آغاز اس نے آج سے تیس سال پہلے کیا تھا۔ یہ سب کایا کلپ کیسے ہو گئی۔ کس موڑ سے اس نے اپنا راستہ تبدیل کیا۔ اب تو اس کی گرد بھی اس کی نشاندہی کیلئے فضا میں موجود نہ تھی۔ وہ آج تک اپنے قلم سے حکومتی ایوانوں میں مسند نشین مقتدر لوگوں کی نمائندگی کرتا رہا تھا۔ اس احساس کے بعد اس کا قلم اتنا بھاری ہو گیا کہ اس روز صبح وہ اپنی انگلیوں سے قلم نہ اٹھا سکا اور نہ ہی کوئی جملہ تحریر کر سکا۔ چاروں پر انکشاف ذات ایک ہی وقت میں ہوا تھا۔ اگرچہ ان کو اس تجربے سے گزر کر اس نقطے پر پہنچنے میں کئی ہفتے لگ گئے مگر حقیقت

ان پر آشکار ہو چکی تھی۔

ایک مرتبہ پھر چاروں ایک ہی وقت میں مرشد کے دروازے پر پہنچے، ایک کنڈی کو چاروں نے ایک مرتبہ کھٹکھٹایا۔ کنڈی ایک بار کھٹکی مگر چاروں میں سے ہر ایک کو لگا کہ کنڈی اس نے کھٹکھٹائی ہے۔ اندر سے ایک آواز آئی۔ آ جاؤ، مگر چاروں کو وہ ایک آواز چار آوازوں کی صورت میں الگ الگ پہنچی اور ہر ایک نے سمجھا کہ یہ اجازت صرف اس کیلئے ہے۔ لہٰذا چاروں ایک ہی وقت میں حجرے میں داخل ہوئے۔ چٹائی پر مرشد محو استراحت تھے۔ عموماً وہ بیٹھے ہوتے مگر آج لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے سر کے نیچے ایک پتھر اور چادر جوان کے کندھوں پر ہوتی تھی، آج ان کے اوپر اوڑھی ہوئی تھی۔ شمالی جنوبی جانب جسم کا رخ اور قبلہ رو چہرہ ڈھلکا ہوا، بازو بالکل جسم کے متوازی اور پاؤں کے انگوٹھے ایک دوسرے میں پیوست جیسے بندھے ہوئے ہوں۔ چاروں نے ایک لمحے مرشد کے چہرے کی جانب دیکھا اور پھر ایک دوسرے کے چہرے کی جانب، چاروں کے چہرے ایک جیسے تھے بالکل مرشد جیسے تھے۔ پہلے صرف آنکھیں یا صرف لہجہ یا صرف پگڑی یا صرف جسمانی خدوخال مگر اب بالکل مکمل طور پر مرشد جیسے ہو گئے تھے۔ مرشد کو اس حالت میں دیکھ کر ایک لمحے میں ہی سب پر حقیقت آشکار ہوئی۔

چند لمحے حجرے میں رکے مگر جس طرف سے آئے تھے، اس دروازے سے واپس نہیں گئے۔ حجرے میں موجود دوسرا دروازہ جو پچھلی جانب کھلتا تھا اور جہاں سے مرشد گھر کے اندر جاتے تھے، وہ اس دروازے میں داخل ہوئے مگر یہ دروازہ گھر کے صحن میں نہیں کھلتا تھا۔ اور جہاں سے مرشد گھر کے اندر جاتے تھے، وہ اس دروازے میں داخل ہوئے مگر یہ دروازہ گھر کے صحن میں نہیں کھلتا تھا جو ان کا اب تک خیال تھا۔ بلکہ یہ دروازہ پچھلی کھلی وادی میں کھلتا تھا جو آگے دریا پار کر کے پہاڑوں تک لے جاتی تھی۔ چاروں نے بہ یک وقت حجرے کے اس پچھلے دروازے سے قدم باہر نکالے اور کھلی وادی کی جانب چل پڑے۔

اگلی صبح کو سب سے پہلے آنے والے عقیدت مند نے حجرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی آواز نہ پا کر اس نے بند دروازے کو کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ حجرے میں کوئی نہ تھا۔ اس نے سارا دن حجرے میں بیٹھ کر انتظار کیا مگر کوئی نہ آیا۔ پورے سات دن گزر گئے۔ درویش کی کچھ خبر نہ ملی۔ اس نے مٹی کھودی، ایک ڈھیری بنائی اور اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ حجرے کے چاروں کونوں پر چار سبز جھنڈے لگائے اور حضرت میاں میرؒ کے مزار سے ایک غلافی چادر لا کر قبر پر پھیلا دی اور آنے والوں کی خدمت گزاری میں جت گیا۔ وہ آنے والوں کو درویش کی زندگی کے قصے اور کرامتیں سناتا اور رات وہیں سو جاتا۔ ایک سال گزرنے کے بعد اس نے نہایت تزک و احتشام سے درویش کے پہلے سالانہ عرس کا انتظام کیا۔ پہلے عرس کے اختتام پر اس کے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ اس نے اپنی بیٹی کی شادی نہایت شان و شوکت سے کی اور پھر ہر اگلے عرس پر اس کی جائیداد، بینک بیلنس میں اضافے کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو ختم ہونے کو ہی نہیں آ رہا تھا۔

☆......☆......☆

نصرت یوسف

سفیرِ سخن

وہاں کی سیر، جہاں ہر قدم پر ماضی دامن تھام لیتا ہے، ہر سانس وطن سے محبت کے قرض میں بندھ جاتا ہے اور ہر پل ایک نیا عزم دل میں جگا دیتا ہے

مارچ کا پُر بہار مہینہ تھا۔ ہم نے اپنی والدہ بہن اور ان کے بچوں سمیت دہلی شہر اپنے ننھیالی عزیزوں سے ملاقات کیلئے رختِ سفر باندھا۔ یہ ہمارا پہلا سفر نہ تھا دہلی شہر کیلئے ہم ان فضاؤں کو بچپن سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اگر سفارتی سطح پر آمد و رفت مشکل ترین نہ بنا دی گئی ہوتی تو ہمارا تازہ ترین سفر آٹھ سال کے وقفے سے بھی نہ ہوتا۔ ان آٹھ برسوں میں ہمارے پاسپورٹ نے کتنی ہی بار نامنظور کا ٹھپہ اور ہر بار اس ٹھپے نے ہم کو کس قدر آزردہ کیا یہ نظام وضع کرنے والے کیا جانیں!

اسکائپ، وائبر، واٹس ایپ، جیسے کتنے بھی ایپلی کیشنز ہوں لیکن تشنگی برقرار ہی رہتی ہے۔ ہم نے بھی جہاز کی سیٹ پر بیٹھ کر آخری ہدایت ملنے سے قبل تک تھری جی سے فیض اٹھا کر اہلِ دلی سے رابطہ رکھا اور پل پل کی خبر دی لیکن منزل پر پہنچ کر جو اپنی آنکھوں سے سب کو دیکھا تو ٹھنڈک ہی اور تھی۔ لگتا تھا جیسے مینتھول کا سپرے کسی نے کر دیا ہو، خواہ مخواہ ہنسی اور سرشاری سی تھی۔ یہ وہ محبتیں تھیں جو جڑوں میں اتری تھیں۔ خالائیں ماموں اور ان کے پھیلے ہوئے پورے خاندان کے افراد سے ملنے کا مزہ ہی اور تھا۔ کچھ ہی دن کے قیام میں منجھلی خالہ انجم نے اتنی سرعت سے گھومنے پھرنے کے انتظامات کر دیئے تھے کہ 8 سال میں اس دلی شہر کی تبدیلیاں ہم سے مخفی نہ رہیں۔ اسی دوران ان کی کالج کی دوست بھی لندن شہر سے اپنے آبائی وطن نیپال جانے کیلئے آ گئی تھیں۔ نام ان کا رجن ہے ڈاکٹر خاندان، سو خاصا نخرہ دکھاتی ہیں۔ میزبان کیلئے سہنا آسان نہ ہوتا لیکن تاریخی دوستی کی لاج نبھانی پڑتی ہے۔ اس دوران ہم نے ان تین دنوں کیلئے خالا جی کو پورا پورا رجن کے حوالے کر کے دوسرے عزیزوں کا رخ کیا۔

کہتے ہیں مسلمان جیسا گوشت کوئی نہیں پکا سکتا اور ہندو جیسی سبزی، سو ہم سب پاکستانی اس بات پر متفق تھے کہ دہلی شہر میں اس بار محض ویج کھانوں کی انواع و اقسام پر گزارا کرنا ہے۔ لہٰذا ہر ملنے والی دعوت کو ہم یہ کہہ کر قبول کرتے کہ کھانا ویج ہو تو ہمیں زیادہ لطف آئے گا اور واقعی ہر بار بہت ہی لطف آیا۔ حقیقتاً مزہ کھانے کا نہ تھا محض بلکہ کمپنی کا بھی تھا۔

ایک بات ہمیں اس وزٹ میں نمایاں طور پر لگی وہ تھا مجموعی طور پر لوگوں کا اختلاف رائے کو معتدل انداز میں برداشت کرنا۔ اگر ناپسندیدگی ظاہر بھی کر رہے تھے تو معقول حد میں رہ کر، کسی انتہا درجے پر کوئی رویہ ظاہر نہ ہو رہا تھا۔ نہ آوازوں میں اور نہ تاثرات میں۔ مسلم دشمنی میں ہندو قوم کتنی بھی متحد اور منفی انداز اپنانے کی صلاحیت رکھتی ہو لیکن اپنے مرتب کردہ نظامِ تعلیم سے انہوں نے اپنے ہاں ایک بہتر قوم تیار کر لی ہے۔ تخلیق اور تحقیق ہر معاملے میں اپنی رعنائیاں بکھیرتی نظر آ رہی تھی۔ ایک ہیئر برش سے لے کر پرانے قلعہ میں لیزر شو کی مدد سے دلی شہر کی تاریخ دیکھنے تک ہر جگہ کام اتنے منظم طریقہ سے تھا کہ جمال اور کمال دونوں ہی نظر آتا تھا۔

مجھے دلی سے محبت ہے! یہ جملہ میری والدہ کہتی تھیں تو وجہ ٹھوس ہے ان کی پیدائش، پرورش اور پھر تعلیم سب اس شہر اور علیگڑھ کی ہیں۔ شادی سے قبل کی تمام تر وابستگیاں اس سے منسلک تھیں۔ میرے نانا نے

اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم کالج سے دلائی تھی کیونکہ دہلی شہر میں تمام مخلوط تعلیمی ادارے تھے تو یہ وجہ رکاوٹ نہ بنی بلکہ شہر بدل دیا۔

ہمیں بھی دہلی سے محبت اپنی ماں سے ورثہ میں ملی ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک کا دارالخلافہ وہی دلی ہے جہاں مسلمانوں نے تقریباً ہزار برس بڑی آن بان کے ساتھ حکومت کی۔ اس شاندار دورِ حکومت کے آثار ہندوستان کے چپہ چپہ پر موجود ہیں۔ بالخصوص دہلی سے تو یہ نشانات مٹائے بھی نہیں مٹ سکے۔ قدیم اور جدید عمارتوں کا حسین امتزاج ہر دور کے فنون کا گڑھ دنیا کی تمام اقوام کیلئے دلچسپی کا باعث ہے۔ سیاحوں کے جھنڈ دہلی شہر میں ہر جگہ ایسے نظر آتے نہیں جیسے تاج محل اسی شہر میں ہو حالانکہ یہاں تاج محل تو نہیں البتہ وہ جگہ ضرور ہے جہاں روایات کے مطابق آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو قید رکھ کر ان کے شہزادوں کے قلم کیے سر خوان میں ان کے سامنے لائے گئے تھے۔ جہاں ان کا تاج اچھالا گیا تھا۔ اسلامی فنِ تعمیر کی عمارتیں جو دلی شہر میں جابجا موجود ہیں گمشدہ عروج کے انمٹ نقوش ہیں۔ یہ مجھے اکثر ہی برصغیر کے ماضی کے سفر پر لے جا رہی تھیں۔ وہ دور جہاں مسلمانوں کے پاس طاقت، اختیار، زور جواہر کا انبوہ تھا مگر علم وحکمت کی درسگاہیں قائم کرنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چہرہ روشن دل ماشاد کے افسانے تھے۔ سبک رفتار ہوا، مخملی گھاس رواں پانی، رقص کرتے فوارے پھل پھول کے نظارے، کثرت سے تعمیر ہوتی عمدہ عمارتوں کا لازمی جز بن چکے تھے۔ مگر ان شاہوں میں سے کسی نے اگر دینی مزاج بھی پایا تو وہ محض ان کی ذات تک محدود تھا۔ ہزار سال کے دورِ حکومت نے کسی بھی ایسی درسگاہ کے آثار نہیں چھوڑے جہاں نت نئے علم وفنون الہامی ہدایات خیر اور بھلائی کے دھاروں سے گزر کر نئی نسل کو منتقل کیے جاتے ہیں۔ تاکہ مشرقی قوتیں دنیا پر غلبہ نہ پا سکیں اور دنیا میں آشتی ناپید نہ ہونے پائے۔ ہاں نئے فنون سامنے آئے تو وہ شکم اور حسن سے جڑے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان حکمران طاؤس ورباب کی طرف رجحان رکھ کر علم وتحقیق کے فن سے اتنے بے نیاز تھے کہ اپنی زمینی جنت کی نگہبانی بھی انہی فرسودہ اور متروکہ طریقوں سے کر سکتے تھے جو اس زمانے کے لحاظ سے بھی موثر نہ رہی تھیں۔ بہترین کھانے، عمدہ ترین نقش ونگار بنانے والے فنکار شعر وشاعری کی کمال صلاحیت، گل وگلزار سے لدے باغات، زر و جواہرات، زیورات اور ملبوسات کی مینا کاریاں، کوئی طلسم سا طلسم تھا جو ہندوستان بالخصوص دلی پر رقص کناں تھا۔ اتنے پرکیف نظارے تھے اور خوشحالی کے وہ لبریز خزانے تھے کہ سات سمندر پار کی اقوام جو تخلیق وفنون کے کمالات دکھا رہی تھیں، اس خطہ زمین پر نظریں لگا بیٹھیں اور چند سالوں کی مختصر سی جدوجہد نے ان کو اس قابل کر دیا کہ وہ ان جھلملاتے رنگوں والی سرزمین پر قابض ہو گئیں۔

یہ قبضہ اس لئے ممکن بنا کیونکہ دلی کے حکمرانوں نے علم وتحقیق کے سوتوں کی سرپرستی نہ کی۔ اس خطہ میں کوئی البیرونی نہ نکلا۔ کوئی موسیٰ الخوارزمی نہ تھا کہ حساب اور الجبرا کی پیچیدہ گتھیاں مسلم نسل کو نئے سرے سے سکھاتا۔ کوئی بوعلی سینا نہ تھا جو طب کے کمالات دکھاتا اور بڑھاتا اور دنیا کی نامور کتاب القانون فی طب لکھ کر دنیا پر خیر کی قوت کی دھاک بٹھاتا۔ جب میدان محض سحر انگیزیوں اور رعنائیوں کیلئے کھچا کھچ بھرا تھا تو برصغیر میں کوئی جامعہ، کوئی مدرسہ، کوئی تجربہ گاہ ایسی نہ تھی جہاں کوئی جابر بن حیان کیمیا میں جوہر دکھاتا۔ ہاں آرائش اور زیبائش عروج پر تھی۔ ذائقہ نت نئے وجود میں آ رہے تھے۔ اور پھر ان سب پر کلی ارتکاز کا نتیجہ وہی نکلا جو روزِ اول سے قانونِ فطرت میں ہے۔

یہ نتیجہ کوئی اسرار نہ تھا جو ششدر کر دیتا۔ ہزار سال کی حکومت کے بعد تخت وتاج مسلمانوں کے ہاتھ سے ایسا نکلا گویا ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے ہندوستان کی سرزمین کو کبھی چھوا ہی نہ ہو۔ ان کے فیوض اور برکات سے اس خطہ کو کبھی آشنائی ہوئی نہ ہو۔ ان کے طرزِ حکمرانی نے اس خطہ کے لوگوں کی تقدیریں بدلی نہ ہوں۔ ان کی گھٹن زدہ عورتوں کے بخت جگائے ہی نہ ہوں دیبل میں بن قاسم اور داہر کا معرکہ ہوا ہی نہ ہو۔ محمود غزنوی نے سومنات توڑا ہی نہ ہو۔ شہاب الدین غوری کی تلوار کی

چمک نے ہیبت نہ طاری کی ہو۔ زوال کے نقارے پر ایسی چوٹ پڑی کہ آخری مغل تاجدار کو برما، رنگون میں قید کر کے خون کی ندیاں بھی بہائی گئیں۔ وہ جگہ جہاں فوارے جھومتے تھے۔ اٹھکیلیاں اور نقرئی قہقہے تھے وہاں بدبختی اور دکھ کے سائے چھا گئے تھے۔ یہ سب قسمت میں اس لئے لکھا تھا کیونکہ محض بزم دل سجانے اور فرش جاں سنوارنے سے زندگی کی بساط پر جیت نہیں ملتی۔ مات سے بچنے کیلئے علم اور آگہی تحقیق اور تخلیق عرفان اور وجدان سارے ہتھیاروں سے قوموں کو لیس ہونا پڑتا ہے۔

دہلی گھومتے ماضی کے یہ باب گاہے بگاہے میری چشم تصور میں ابھرتے رہے۔ اس سال سردی کا قیام معمول سے زیادہ طویل ہو گیا تھا۔ یہ لہر ہمارے لئے بہت ہی بھلی رہی۔ ہم کراچی والے پنجاب کے خطہ کی گرمی اور سردی دونوں ہی برداشت نہیں کر پاتے جبکہ موسم اپنے جوبن پر ہو۔ یہ سردی کی موجودہ لہر خوشگوار سی ٹھنڈک والی تھی۔ ہڈیوں کا گودا نہیں جم رہا تھا۔ جبکہ معمول کے مطابق چلچلاتی اور چبھتی سی دھوپ سورج کے موسم کے ہلکے پھلکے آغاز کا دور تھا۔ لگتا تھا رب نے ہمارے وزٹ کو خوشگوار بنانے کیلئے اتنا دلکش موسم کر دیا ہے جہاں کبھی نیلے شفاف آسمان پر بادلوں کے ڈھیروں ٹکڑے برف کی ڈلیوں کی مانند تیرتے نظر آتے تھے۔ اور پھر سرمئی سا شیڈ چھا جاتا اور پھوار کچنار کے درخت پر جب برستی تو پھولوں سے لدی اس کی شاخیں جیسے ہمارے دل کو خوشی سے بھر دیتیں۔ یہ درخت میری چھوٹی خالہ سعدیہ کے سول لائنز والے فلیٹ کے نچلے احاطے میں کھڑا تھا۔ ٹیرس میں جانے کی بھی ضرورت نہ تھی کمرے کے اونچے شیشے کے دروازے سے پردہ ہٹاتے ہی کچنار کی خوشبو نتھنوں سے ٹکراتی اور ٹپاٹپ اس کے پھول ہوا کی مستی میں ساتھ دیتے نیچے گرتے دکھائی دیتے۔ سرمئی بادلوں کے ساتھ اردگرد لال اینٹوں سے بنی عمارتیں اور وافر درخت ایک مکمل تصویر لگتے جو مصور نے تازہ تازہ تیار کی ہو۔ ہر چیز میں ترتیب اور حسن دور دور تک کوئی ہورڈنگ یا بل بورڈ دہلی شہر میں نظر نہیں آتا۔ اور اگر ہے بھی تو پرانے علاقوں میں۔ کراچی میں ہم تو جیسے بل بورڈ اور ہورڈنگز کے آسمان تلے ہی سانس لیتے ہیں۔ کراچی پاکستان کا دارالخلافہ موجودہ بے شک نہیں لیکن کیا ایک اہم ترین شہر بھی نہیں جس کے دکھ سکھ سے وفاق کو کوئی واسطہ نہ ہو؟ ایسا ہے یا نہیں بہرحال ہم کراچی والے صفائی ستھرائی کی غیر معیاری سطح پر سانس لیتے ہیں۔

مارچ کی ایسی ہی خنک سی شام میں لودھی گارڈن کی پکنک طے کی گئی۔ عام دن تھا لہٰذا صرف خواتین اور بچے ہی مستفید ہو سکتے تھے۔ موسم بہار جوبن پر آ رہا تھا میں نے باغ میں داخل ہوتے ہی کچھ ٹھنڈک کا زیادہ احساس پایا تو کارڈیگن کی زپ اونچی کر لی۔ خالہ آپی!! میری بھانجیوں نے میری طرف دیکھا اور قل قل کر کے ہنسنے لگیں۔ انہیں میرے کارڈیگن اور لیدر شوز پر خاصا اعتراض تھا۔ میں نے بھی کچھ مزے کا جواب دینا چاہا لیکن میری کزن نے بازو سے مجھے پکڑ کر روک لیا۔ دیکھو رنگ برنگی تتلیاں، اف کیا شاہکار منظر تھا وہ دودھیا ہری، نیلگوں، پیازی، کتنے ہی رنگ کی تتلیاں اس خوبصورت کنج میں تھیں۔ پھولوں کا حسن آنکھوں میں تازگی بھر رہا تھا اور ان پر منڈلاتی وہ من موہنی تتلیاں اپنے خالق کی رعنائی پر دنگ ہوتیں ان کی پنکھڑیوں کے بوسے لے رہی تھیں۔ سبحان اللہ، کے سوا کچھ نہ تھا جو اس پر بہار منظر کے شایان شان تعریف ہوتی۔ بوٹے بوٹے پر رعنائی تھی۔ اٹھتے قدم کچھ فاصلے پر ٹھٹک جاتے۔ سبزے کی باس، گرم گرم کافی کی یاد دلا رہی تھی۔ یہ بے انتہا وسیع و عریض باغ ہے جو نوے ایکڑ سے زیادہ رقبہ پر پھیلا ہے۔ عوام کو صحت اور تفریح کی سہولیات مہیا کرنے کیلئے دہلی شہر میں خاصے اچھے انتظامات ہیں۔ اوپن ایئر جم اکثر باغات میں مل جاتے ہیں۔ واش روم صفائی کی عمدہ حالت میں نظر آتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ دہلی شہر میں انسانوں کا انبوہ کثیر ہے جوٹڈی دل کے لشکر نما سا لگتا ہے بالخصوص میٹرو ٹرین کے اسٹیشن پر جب انسانی ریلا سیڑھیوں سے اتر رہا ہوتا ہے مگر ان کی منظم حرکات پر رشک آتا ہے۔ نہ کوئی چھالیہ کا کاغذ اڑ رہا ہوتا ہے اور

نہ پان کی پچکاری کی گلکاری بناتا ہے۔دیکھنے میں سب مہذب قوم کے مہذب افراد ہی لگتے ہیں جن کی وفاداریاں اپنے ملک وقوم کے ہر اثاثے کے ساتھ سچی ہوں۔

پھولوں کے ایک ایسے ہی کنج میں مقامی ڈرامہ سوسائٹی اپنا کوئی ڈرامہ سین مختلف لوگوں سے ادا کروا رہی تھی۔نہ کوئی سیٹی تھی اور نہ ہی کوئی شور۔اتنی شائستگی سے یہ سب کچھ ہو رہا تھا کہ جیسے یہ سب سرگرمی نہ ہو بلکہ درخت، پھول اور پھلواری ہوں جو ہوا کے ساتھ ہلکورے لے رہے ہوں۔سیاحوں کے ایک گروپ نے ہمارے عبایہ سکارف والے حلیہ باغ میں بہت ہی خاص جانے تو ایک خاتون نے درخواست کی۔''کیا ہم آپ کا ایک گروپ فوٹو لے سکتے ہیں''؟

دیکھنے میں چینی یا کورین خدوخال کی وہ دوشیزہ انگریزی میں ہم سے پوچھ رہی تھی اور جواب دینے سے پہلے ہم عبایہ یوں کہہ لیں نجا ممبرز کو ہنسی آ گئی۔یس شیور۔اور ہمارے جواب ملتے ہی کھٹا کھٹ کیمرے کی آنکھ نے ہمیں قید کر لیا۔چلو بھئی ہمارا سفر دہلی تک نہیں بلکہ ان کی چینی جاپانی یا کوریائی سرزمین تک ہو گیا۔

خوب محظوظ ہوئے میری نگاہ لودھی کے مقبرے کی عمارت پر جم گئی تھی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے میں جیسے جیسے اس کی جانب بڑھ رہی تھی،ایک سحر سا تھا جو طاری ہو رہا تھا۔میزبانوں نے ایک گوشہ منتخب کر کے چادر بچھالی تھی۔ اوراب پنیر سینڈوچ کے ساتھ بھاپ اڑاتی کافی سرو کی جا رہی تھی۔میرے اٹھتے قدم دیکھ کرامی نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا میں نے گردن کے اشارے سے لودھی کے گوشہ آرام کی جانب اشارہ کیا اور آگے بڑھ گئی۔

چلو وہ گئیں آتما سے ملنے، مجھے عقب سے کسی میزبان ممبر کی چلبلی سی آواز آئی اور مسکراہٹ نے مجھے آسودہ کر دیا۔یارب یہ رشتے آپ نے کتنے خوبصورت بنائے ہیں۔

مینا کاری سے مزین اینٹوں سے مسلم انداز کی بنی عمارت سکندر لودھی کی آخری آرام گاہ ہے۔عمارت قدیم [illegible] میں اس کے مقبرے میں کھڑی تاریخ کے

اس باغ میں محمد شاہ کا مزار شیش گنبد اور بڑے گنبد کے نام سے بنی عمارتیں بھی مختلف مقامات پر موجود ہیں۔یہ تمام مسلم انداز تعمیر کے دلفریب نمونے ہیں۔قدیم عمارت کی پہلی اینٹ پر قدم پر رکھتے ہی گویا انسان اس کے عہد میں سانس لینے لگتا ہے۔بالخصوص وہ عمارتیں جن سے قوموں کے عروج وزوال کے رشتے کے سلسلے گندھے ہوں۔

میں ماضی اور حال کی درمیانی راہ پر تھی کہ عقب میں آہٹ ہوئی اور گرم کافی کا کپ کزن نسترن نے ہاتھ میں تھما دیا۔ہاتھوں کو گرم مگ کے گرد لپیٹتے میں نے اس کے گولڈن براؤن بالوں میں سفید گلاب کی کلی اٹکی دیکھی تو بے اختیار میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔نسترن کو نسترن کی کیا حاجت جانی! تم تو اسم بامسمیٰ ہو۔نسترن سفید گلاب۔

میرے تبصرے پر وہ بلش ہو گئی۔سفید گلاب اب گلابی ہو چکا تھا۔ یہ ڈائیلاگ میرے میاں کو بھی سنایئے گا وہ شوخی سے بول کر ہنس دی۔

میں مقبرے کی سیڑھیوں پر کھڑی تھی شام تا حد نگاہ پھیلے سرسبز میدان میں اتر رہی تھی۔نسترن اپنے چھوٹے سے بیٹے کی فکر میں پلٹ کر جا چکی تھی۔مجھے ایسا محسوس ہوا کہ لودھی کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے باغ میں ہلچل سی ہو گئی ہو۔تصوراتی دنیا پوری طرح متحرک ہو گئی تھی۔وہ دلی جو آج ہم سے جدا ہے کل ہمارے زیرنگیں تھا لودھی اور افغان یہاں فتح کے جھنڈے گاڑتے اس کو سجانے سنوارنے میں مصروف تھے۔پھر مغلیہ دور حکومت کے نشانات ابھرے یہ سب ایک آدھ صدی کی بات تو نہیں تقریباً ہزار سال پر پھیلا عروج ہے۔کیسا عروج پایا اور پھر کیسا زوال نصیب بنا۔رب سے گریہ وزاری کر کے اس کا کرم مانگا۔خطہ زمین مانگا جہاں مفتوح قوم کے بجائے فاتح کی شان سے کلمہ توحید کا سایہ نصیب ہو اور پھر رب نے سنا بھی اور بخشا بھی۔

مقبرے کی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں اور سوچیں بھی محوِ سفر تھیں۔ پلیٹ فارم گو بہت زیادہ بلند نہ تھا لیکن سوچوں نے قدموں کو جما سا دیا تھا۔

ان دوسروں کے درمیانی عرصے کو چشم تصور سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ میں تھامے کافی مگ سے گھونٹ بھرا۔ خنکی نے اس کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ کب تک گرم رہتا۔ حرارت ہمارے جذبات اور احساسات کی بھی ایسی ہی ٹھنڈی ہو چکی ہے من حیث القوم مگ میں نے سیڑھیوں کے ساتھ ہی منڈیر پر ٹکا دیا۔ مقبرے کے اندرونی حصے میں اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔ تاریخ ان کے لئے ایسی دلخراش نہ تھی کیونکہ راج پاٹ ان کا تھا۔ سوز خم بھر چکا تھا۔ وہ اب تصویریں بنانے میں گم تھے۔

تمہیں سنا نہ سکے جو کچھ' کیا دہرائے میرے سکوت نے وہ فسانے؟ مقبرے کے در و دیوار سے سرگوشی ابھری۔ میں نے چونک کر سر اونچا کیا۔ لودھی کیا اب بھی گھوڑے کی پیٹھ پر ہے؟

لودھی گھوڑے کی پیٹھ پر ہوتا تو کیا اس کی مسلمان قوم کو برصغیر کے بٹوارے کے وقت آگ اور خون کے دریا سے گزرنا پڑتا۔ کیا اس کی ماؤں بہنوں بیٹیوں کے سہاگ اور شباب تہہ تیغ کوئی کر سکتا؟ میرے دل میں ابھرے سوال کا فضاؤں سے جواب تھا۔

مملکت خداداد پانے کیلئے حوصلوں کی کرامت کی ضرورت تھی۔ ان گنت نے اپنی جانیں، حرمتیں مال دان کر دیئے کہ آنے والی نسلیں خبیثہ سے محفوظ رہ سکیں مگر احسان فراموش انسانوں نے سب کچھ بھلا دیا۔ ہواؤں کا جھکڑ سا مجھے محسوس ہوا ''یہاں ایک سیلفی۔'' ان کو ہوائیں کیوں نہیں ہلا رہیں؟ میں نے حیران ہوتے ہوئے اس نوعمر غیر مسلم جوڑے کو دیکھا جو مقبرے کی کسی دیوار کے ساتھ کھڑا سیل فون سے تصویریں لینے میں گم تھا۔

انہوں نے رب سے عہد باندھ کر نہیں توڑا نہ بندگی کا دعویٰ کیا تو کیسی پرسش؟ ان کیلئے جو دن مقرر ہے اسی دن کا حساب، پر تمہارے قدم کیوں بہک گئے' جھکڑ تمہارے لئے ہیں۔

جواب ہواؤں نے پھر ناراضگی سے دیا۔ سامنے نظر آتا کافی کا مگ بھی لڑھک گیا۔ سیال بہہ کر مٹی میں جذب ہو گیا۔ میں نے انگلی سے اسے چھوا۔ یخ مٹی تھی۔

''یہ ایسی ہی ہے جیسے احسان فراموشوں کی مٹی'' اب کے بات بہت کڑوی تھی۔ مقبرے کی دیواریں اس اب نم آلود سی ہو گئی تھیں۔ جب تک قوم کی کمان آبرومندوں کے حوالے رہتی ہے اس وقت تک اس کا بھرم زندہ رہتا ہے۔ اب کے وہ نوعمر جوڑا ایک دوسرے کے ساتھ فلمی قسم کے سین بطور سیلفی لے رہا تھا۔ میرا دل چیخا ''احترام کرو یہ انسانی وجود کے مٹی میں ملنے کا مقام ہے۔ یہاں ذات ختم ہو کر بے نشان ہوتی ہے اور اعمال بقا پاتے ہیں۔ تم اس جگہ ذات کی خودنمائی میں مگن ہو نادانو!!''

یہاں محدود ختم ہو کر لامحدودیت بن جاتا ہے۔ دل نے پھر فلسفہ سنایا۔ مگر لب خاموش تھے۔ کیسے کہتے جرم ضعیفی اور مرگ مفاجات ظاہر تھے۔ حکومت ہند نے ہر اسلامی تاریخی عمارت پر بزور طاقت اپنے احکامات نافذ کر رکھے ہیں۔ مسجدوں میں نمازیں ادا کرنے کی ہی اجازت نہیں۔ آسمان سے کچھ قطرے ٹپکے۔ میں نے بے اختیار نظریں لامحدود وسعتوں پر اونچی کیں۔

دیکھو تو سہی کرشن جی کی تصویر بادلوں میں۔ وہ الہڑ حسینہ سیلفی بھول بھال، شروع ہوتی بوندا باندی سے پرجوش ہوتی افق کی جانب اشارہ کرتی اپنے ساتھی کو متوجہ کر رہی تھی' ٹھیک ہی کہا ہے شاعر سلیم احمد نے کہ لوگ وسعتوں میں شعور کھو دیتے ہیں۔ میں نے گلابی گہرے رنگ کے مختلف شیڈز کے بادلوں سے بنے تجریدی شاہکار کو آسمان کے کینوس پر سجے دیکھا اور ہاتھوں کے پیالے میں بوندوں کو روکنا چاہا۔

''سورج جلدی ڈھل گیا آج آریہ۔'' بے فکر ہنسی ہنستی ہوئی وہ لڑکی ساتھی کا بازو تھامتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف آ گئی۔ ہم افسردگی کے درمیان ہی تھے اور اس کی آنکھوں میں دیپ جل رہے تھے۔

مقبرے کے اندرونی حصے کی جانب میرے قدم بڑھ ہی نہ پائے مجھے وہاں سائے لہراتے محسوس ہو رہے تھے۔ ماضی سے آ کر حال کو جھنجھوڑنے کیلئے بے تاب، دھوپ اور چاندنی کے راز دہرانے کے آرزومند۔ لیکن میں ان کے اشارے پا کر بھی ان تک نہیں گئی۔ ویرانی سی دل میں اتر آئی تھی اور فاصلے سے آتی مدھم آوازیں مجھے متوجہ کر رہی تھیں۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

میلبورن کی ماسیاں

آپ سب کو عید مبارک بڑی خوشی کی بات ہے کہ چار کی بجائے صرف دو عیدیں منائی گئیں۔ یعنی جمعے اور ہفتے کو...... میلے، چاند رات اور عید میلہ...... آنا جانا۔ ملنا جلنا، کھانا گھر میں اور باہر خوب رونق رہی۔ ہم نے بھی ایک دعوت کا انتظام کیا کہ سال کے بعد یہ دن آتا ہے وہ بھی پردیس میں...... دیسی کھانے پکائیں ان کی اپنی لذت شلوار قمیض پہنیں...... اپنا فیشن، خوبصورت اور آرم دہ۔ اردو بولیں یا پنجابی...... انگریزی بول بول کر زبان تھک گئی ہے۔

کھانا بنایا بلکہ ایک دن پہلے سے بنانا شروع کر دیا تاکہ مطلوبہ تعداد اور معیار کو قائم رکھا جا سکے سب دوست مہربان بچے بڑے آئے۔ عید ملے، عیدی وصول کی۔ خوشی ہوئی، کھانا کھایا۔ تعریف ہوئی (یہ الگ بات ہے کہ کئی کھانوں کا شجرہ زبانی یاد نہ تھا اس لئے ان کو کوئی نام نہ دے سکے)

کھانے کے بعد میلے برتنوں کا ایک انبار عید کی خوشیوں میں لیمن نچوڑ رہا تھا۔

مہمانوں نے مختلف مشوروں سے نوازا۔

پہلا...... رہنے دیں آپ میں ابھی دھو دیتی ہوں۔

دوسرا...... آپ نے ڈش واشر نہیں لگوایا...... بھئی مجھ سے اتنے برتن نہیں دھلتے۔ میں تو واشر میں لگا دیتی ہوں۔

تیسرا...... آپ نے کاغذ کے گلاس اور پلیٹ کیوں نہیں منگوائے۔ کھانا کھایا اور پلیٹ ڈسٹ بن میں۔ آرام ہی آرام۔ اب تو زمانہ اتنا ماڈرن ہو گیا ہے اور ہم آسٹریلیا آ کر بھی برتن ہی دھوتے رہیں۔

چوتھی آواز...... آپ کلینز (دھونے والی ''ماسی'') کیوں نہیں رکھ لیتیں۔

پانچویں...... بلکہ گھر بھی صاف ہو جائے گا اور برتن بھی دھل جائیں گے۔

چھٹی...... آپ نے ویسے بھی افسانے اور ناول لکھنے ہوتے ہیں یہ کوئی کام ہے آپ کے کرنے کا (میرے بیٹے کو مخاطب کر کے) کیوں عرفان بھائی...... آپ ڈاکٹر صاحبہ کو کلینز کیوں نہیں رکھ دیتے؟

عرفان...... اچھا جیسے ان کی مرضی...... ضرور رکھ لیں۔

دوسری آواز...... یہ لیں اخبار...... اس میں صفحہ نمبر 20 پر کافی سارے اشتہار ہیں کلیننگ کے...... ان کو فون کر کے ڈن کر لیں کام ہو جائے گا۔

جاتے جاتے شمزہ نے بھی تاکید کی فون کر کے ''ماسی'' کو رکھ لیں۔ یہاں کی ''ماسیاں'' بڑی ہوشیار، طرحدار، ایماندار، کار پہ سوار آتی ہیں، منٹوں میں صفائی کر کے یہ جا وہ جا۔

اچھا جی بہت اچھا۔ آپ سب کے نیک مشوروں کا بہت بہت شکریہ۔ فکر نہ کریں اس اتنے اہم موضوع پر سنجیدگی سے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ آج آپ اتنے سارے دانشور میرے گھر اکٹھے ہوئے تو یہ ضروری پیش رفت ہو گئی ہم تو سمجھے تھے کہ ایران کا معاہدہ ہی بڑی خوشی کی بات ہے مگر یہ بھی کم نہیں مزید شکریہ۔

دوسرے دن ہم اخبار لے کر بیٹھے۔

پہلا فون ملایا...... نو رپلائی

دوسرا ملایا...... جواب ملا دس نمبر سے ڈس کنیکٹ۔

خیال آیا اس نیک کام سے پہلے بسم اللہ بہت ضروری تھی غلطی ہو گئی۔ بسم اللہ کی اور تیسرا نمبر ملایا۔

فوراً جواب آیا، ہیلو آئی ایم جون...... ہو آر یو......

جی تو چاہا کہ کہہ دوں میں جولائی ہوں۔ لیکن اس کو بتایا۔

کہنے لگی او کے...... میں شام کو آؤں گی تمہارا گھر اور کام دیکھوں گی پھر اپنی مزدوری بتاؤں گی۔

شام کو بیل بجی۔ نہایت ماڈرن بلیک ٹائٹس اور ٹاپ میں ملبوس......

کھلی زلفیں، مناسب میک اپ۔ گلے میں زنجیر ہاتھ میں انگوٹھیاں اور موبائل...... ہم نے سمجھا کوئی مہمان ہے۔

ہیلو......

ہیلو۔ آئی ایم جون......

ہم نے دل میں سوچا واقعی پاکستان کا جون ہے کہ اتنی سردی اور محترمہ نے کوئی سوئیٹر یا جیکٹ تک نہیں زیب تن کی کوٹ تو دور کی بات ہے۔ ہم نے اندر بلایا، ہاتھ ملایا، صوفے پہ بٹھایا۔ چائے کافی کا پوچھا آنے کا مقصد دریافت کیا تو بولیں۔

صفائی کے لئے آئی ہوں۔ مجھے گھر دکھا دو۔ میں 30 ڈالر فی گھنٹہ لوں گی

اچھا...... اچھا۔ یہ ایک بیڈ روم ہے یہ دوسرا...... یہ لاؤنج...... یہ کچن ایریا۔ چھوٹا سا گھر ہے۔

نو نو...... وری گڈ...... تمہارا اپنا ہے...... تاریخ بتا دو۔ کب سے شروع کروں۔ ہفتے میں ایک بار یا پندرہ دن بعد یا ایک ماہ بعد......

کافی...... چائے...... تمہیں سردی لگ رہی ہوگی۔

نو نو...... آئی ایم ہاٹ۔ کام کر کے آ رہی ہوں۔ I Love my work

تم بتاؤ......

دو گھنٹے لگیں گے۔ فرج اور مائیکرو ویو بھی۔ 60 ڈالر لوں گی۔ نہ ایک ڈالر کم نہ زیادہ۔

یہ زیادہ نہیں ہیں...... نو نو...... آئی ایم جون فرسٹ کلاس کلینر۔ 15 سال ہو گئے ہیں۔ بولو بولو...... کب آؤں...... اگلتے ہفتے...... سنڈے ٹھیک ہے؟

ہاں ٹھیک ہے کسی دن بھی آ جاؤ پہلے فون ضرور کرنا۔ پھر سنڈے گزر گیا...... وہ نہ آئی میں نے فون کیا تو موبائل بند...... تین دن کرتی رہی چوتھے دن مل گئی۔

اوہ آئی ایم سوری...... میری ماں بیمار ہے میں ہسپتال میں تھی میں نہیں آ سکتی۔

ہم نے اناللہ پڑھا اور پھر اخبار لے کر بیٹھے...... ایک، دو تین چار پانچ چھ...... فون کر ڈالے کیونکہ اخبار میں اتنے ہی اشتہار تھے صرف ایک نے اٹھایا۔ اس نے کہا ہماری میٹنگ ہو رہی ہے گھنٹے بعد تمہیں فون کریں گے۔

اب شام کو کالیں آنا شروع ہوئیں۔

ہیلو کون...... اس نمبر سے تمہاری کال آئی تھی۔ میں کام کرتے ہوئے فون نہیں اٹھاتی۔ اب بتاؤ کہاں رہتی ہو۔ نام کیا ہے۔ کب آؤں کس دن۔ گھر کتنا بڑا ہے پتہ لکھوا دو یا میسج کر دو۔

لگتا تھا اس نے آگ بجھانے جانا ہے میں نے کہا کہ منڈے ایک بجے دن۔ او کے۔ ڈارلنگ بائے۔ سی یو آن منڈے۔

پھر دوسرا فون آیا۔ ہواز دیئر...... آئی ایم جم...... وری گڈ۔

صفائی کمپنی...... نام، کہاں رہتی ہو، ایڈریس دو...... کب آؤں سنڈے؟

نو...... نو مجھے خاتون چاہیے۔

او کے ویل ڈن...... میری وائف آ جائے گی۔

اچھا...... منگل کو ایک بجے آ جانا پھر تیسرا فون آیا۔

ہیلو آئی ایم سونیا...... صفائی آفس...... نام، ایڈریس، کتنے گھنٹے

کب آؤں......

میں نے کہا فرائی ڈے دس بجے۔

پھر چوتھا فون آیا......آئی ایم فرام ٹی آر کمپنی......

میں نے بند کر دیا۔شمزہ (میری دوست ہے) اس کو فون کیا کہ ماسیوں نے یلغار کر دی ہے کیا کروں۔

وہ بولی......کیا یلغار فلم میلبورن میں لگ گئی ہے کب...... یہ بڑی اچھی فلم ہے۔

نہیں......ماسیوں نے فون کر کے میرے ناک میں دم کر دیا ہے میں کیا کروں۔ پہلے تو پتہ نہیں تھا۔اب یہ سب آئیں گے باری باری۔تم آ جاؤ نا......

وہ بولی......بہتر ہے ان سمارٹ ماسیوں کی بجائے خود ہی برتن دھولیں یا کاغذ کے برتن بھی ٹھیک ہیں۔

سب سے پہلے پیر کے دن بلنڈا (Balinda) کا فون آیا۔ کہنے لگی۔ میں دس بجے آ رہی ہوں۔آئی ول ٹاک ٹو یو...... میں تم سے بات کروں گی۔اپنا پتہ لکھوا دو۔

وہ دس بجے آ گئی۔

دراز قد۔گورا رنگ۔کھلی ہوئی زلف بریدہ۔شانوں تک آنے سے پہلے ہی پر کٹ گئے۔

بلیک پینٹ۔سفید مردانہ قمیض اور سیاہ جمپر اوپر سیاہ جیکٹ۔ انتہائی مہارت سے کیا ہوا میک اپ۔ہاتھ میں آفیشل بیگ......

ہیلو......گڈ مارننگ......آئی ایم بلنڈا۔

یس......پلیز کم......اندر آ جاؤ۔تشریف رکھو۔ باہر بہت سردی ہے بلکہ بارش بھی ہو رہی ہے۔چائے یا کافی......؟

نونو......تھینک یو......گھر دکھا دو۔یہ بتاؤ کیا کیا کام کروانا ہے۔

وہ بولی میں کمپنی کی منیجر ہوں۔ بک کرتی ہوں اور پھر جس دن تم کہو گی میں صفائی والے افراد بھجوا دوں گی۔

گڈ......تین بیڈ روم۔ایک لاؤنج...... یہ کچن ایریا...... باتھ روم، لانڈری یہ چھوٹی سی لائبریری ہے اور یہ برآمدہ......سمال ہاؤس...... چھوٹا سا گھر ہے۔

نونو......وری گڈ۔بگ ہاؤس۔تمہارے لئے بالکل ٹھیک ہے۔ کام بتاؤ۔

صفائی...... ویکیوم، ڈسٹنگ، واشنگ، قالین اور فرش دونوں دیواریں۔ الماریاں، فرج، مائیکرو ویو اوون۔ چھت والے پنکھے۔ کھڑکیاں......

اس کے ہاتھ تیزی سے میری بتائی ہوئی تفصیل کو ایک نوٹ بک میں لکھ رہے تھے۔

تم نے پہلے کبھی صفائی کروائی ہے؟

ظاہر ہے گھر گندا تو نہیں لگ رہا۔ میں خود کرتی ہوں۔

نہیں میرا مطلب ہے کسی پروفیشنل سے......

ہاں دو ویت نامی لڑکیاں آتی تھیں بہت ہی ایماندار اور تیز کام کرنے والی تھیں میں ان کو بہت مس کرتی ہوں۔

اچھا ہر ہفتے یا فورٹ نائٹ (15 دن بعد)

ہر ہفتے ٹھیک ہے......

میرا خیال ہے 15 دن بعد کروا لو......بلنڈا بولی۔

80 ڈالر ہوں گے۔اس میں کھڑکیاں شامل نہیں ہیں۔

وائی......وہ کیوں......؟

میرا خیال ہے میں پہلے کام دیکھوں گی پھر فیصلہ کروں گی۔

نونو......گڈ ورک وری گڈ۔ڈونٹ وری......

اچھا کب بھیجو گی؟ میرا اگلا سوال تھا۔

جب تم کہو...... وہ ذرا سا مسکرائی جیسے مسکرانے پر بھی خرچہ آتا ہے۔

کل ہی ٹھیک ہے۔

اوکے میں ان کے آنے سے پہلے فون کردوں گی۔

تھینک یو......

تم کس ملک سے آئی ہو......؟

پاکستان سے......

پور کنٹری......وری بیڈ پولیٹیکل حالات......سوسوری......

نونو......وی آرناٹ پور۔اب حالات اچھے ہورہے ہیں۔

اوکے ڈارلنگ بائے۔اس نے ہاتھ ملایا۔باہر سفید رنگ کی ٹیوٹا کیمری کھڑی تھی۔

میں نے سوچا واہ بھئی یہاں صفائی والوں کی بھی عیش ہے۔ ہماری ماسیاں دیکھ لیں تو سب ویزے کیلئے اپلائی کردیں۔

ہم نے سوچا کافی مغز ماری اور کامیابی ہوگئی۔اس واقعے کی یاد میں ایک کپ چائے کا ہوجائے۔

اتنے میں پھر بیل ہوئی۔

کون......آئی ایم جم......صفائی والا۔

سوری جم مجھے صفائی والی لیڈی کی تلاش ہے نومین (آدمی نہیں)

میری بیوی آجائے گی۔مگر ابھی اس کا بچہ پیدا ہوا ہے۔ایک ماہ بعد آسکتی ہے۔شی از ینگ......

نو تھینک یو......

میرا 20 سالہ تجربہ ہے۔تمہارا گھر خاصا گندا ہے۔

آئی نو......مجھے معلوم ہے۔تھینک یو۔

دوسرے دن صبح صبح بلنڈا کی کال آئی۔ میں صفائی والے بھجوا رہی ہوں مگر بڑے زور کی بارش ہورہی ہے۔

(پھر کیا ہوا بارش میں کام بند تو نہیں ہوتے)۔

تھوڑی دیر بعد پھر بیل ہوئی۔

ایک درمیانی عمر کا مرد اور ایک 18 سالہ لڑکا نیکر اور ٹی شرٹ پہنے بالٹی،موب،صابن تولیے برش،ہیلو میڈم ہم صفائی کیلئے آئے۔ میں کم

ہوں یہ سواگ ہے۔

مگر مجھے تو لیڈی چاہیے......نو مین آدمی نہیں۔

اچھا......وہ حیران سے ہوکر بولے......اوکے میڈم......ہم بلنڈا کو فون کرتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد کہنے لگے کل لیڈی آجائے گی اوکے بائے۔

اگلے تین بجے پھر بیل ہوئی۔ یہ وقت ذرا نماز عصر کے بعد آرام کرنے کا ہوتا ہے۔

کون......؟......میڈم کلینگ پرسن......(Cleaning Person)

مگر مجھے تو لیڈی......

لیڈی ہے گاڑی سے اتر رہی ہے۔وہ دیکھیں۔

اوہ......مگر یہ تو......میں چپ ہوگئی۔

لیڈی کسی نئے مہمان کی منتظر تھی۔ایسی حالت میں اس سے کام لینا بالکل زیادتی تھی۔

تم کام کروگی......؟میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں پہلے کام کرتی تھی۔اب نہیں کرتی، فارغ ہونے کے بعد کروں گی یہ میرا شوہر ہے اور یہ سٹوڈنٹ ہے۔دونوں کریں گے میں ان کو واچ کروں گی......

کیوں ان کو کام کرنا نہیں آتا۔

آتا ہے۔آپ ان کا سٹرفکیٹ دیکھ لیں۔مگر آپ کی شرط تھی کہ لیڈی ہو......اس لئے میں آئی۔

ہم نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔اب انہوں نے کام شروع کیا۔لیڈی اجیت کور تھی۔

بندہ وکرم سنگھ......

گھر بڑا گندہ ہے جی......بڑی دیر لگے گی۔

میں چپ......وے چھیتی چھیتی ہتھ مار......چھوٹے اوون دے اندر گرم پانی پا......وکرم......توں باتھ روم ول جا......میں فرج تے

مائیکروویو......

اس نے کپڑا لے کر دونوں کو باہر سے صاف کیا۔

میں نے کہا بس...... جی اندروں نہیں کری دا۔ بس اتنا ہی ہوتا ہے۔

وکرم بولا تہاڈا باتھ روم بڑا گندہ ہے۔

جے صاف ہندا تے تہاڈی کیہ لوڑ سی۔

اچھا جی اسی چلیئے...... تے کھڑکیاں......نہیں بچی نوں سکولوں لینا اے اگلی واری سہی۔ ہم نے چپ کر کے اسی ڈالر دیدیئے کہ یہ بے چاری اس سردی میں اس حال میں مزدوری کرنے آئی ہے۔ ہار نہیں مانی۔ باقی پھر سہی۔

☆......☆......☆

شمیم فاطمہ

جانچتے پرکھتے

پروین شاکر کا یہ شعر آپ کی سماعتوں اور نگاہوں سے ضرور گزرا ہوگا کہ ؂

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں

بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

معلوم نہیں کہ پرکھنا چالاکی ہے یا سمجھداری...... لیکن پرکھنا کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کا شوق اور کچھ لوگوں کی ذمہ داری...... جانچنے پرکھنے کی عادت بچوں، بڑوں، مردوں، عورتوں، کالوں، گوروں، صاحبوں، ماتحتوں، آقاؤں (اور شاید غلاموں میں بھی) بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ جانچ پڑتال کچھ لوگوں کی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں میں شامل ہوتی ہے...... مثلاً فوڈ انسپکٹر، پولیس انسپکٹر، ممتحنین اور طبی ماہرین وغیرہ...... ممتحنین کاپیوں کی جانچ پڑتال کر کے یہ بتاتے ہیں کہ کاپی والا کسی گریڈ کا طالب علم ہے اور طبی ماہرین خون کی جانچ پڑتال کر کے یہ بتاتے ہیں کہ خون صاف ہے یا فاسد (لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ اعلیٰ ظرفی کے جراثیم صاف خون میں پائے جاتے ہیں یا فاسد خون میں!)

جانچنے پرکھنے کا عمل شفاف نتائج کے لیے انتہائی ناگزیر ہوتا ہے...... اس کے بغیر کھرے اور کھوٹے...... اصلی اور نقلی...... دوست اور دشمن...... معیاری اور غیر معیاری...... اعلیٰ اور گھٹیا...... صحیح اور غلط کی پہچان کی جا سکتی ہے نہ فیصلہ......! (اگر کر لیا جائے تو جوڈیشنل کمیشن کا قیام عمل میں لانا پڑتا ہے)

جانچنے اور پرکھنے کا عمل ہمارے روزمرہ میں یوں شامل ہے جیسے ہماری زندگیوں میں لوڈشیڈنگ شامل ہے...... ہم کیا اور ہماری بساط کیا!...... (ہر چند کہ...... ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا!) مگر پھر بھی جب کبھی جیب میں دھیلا ہو اور بازار کا رُخ کریں تو کپڑے پر انگلیوں کے پور رگڑ رگڑ کر یہ جانچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ موٹا ہے یا مہین...... سوتی ہے یا ریشمی۔ آخرت کی طرح پائیدار ہے یا دنیا کی طرح ناپائیدار...... اسی مقصد کے لیے مٹی کے پیالے کو بھی ٹھونکتے بجاتے ہیں...... آلو خریدتے ہوئے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں (کہیں داغی تو نہیں!) آم کو ناک کے قریب لا کر سونگھتے ہیں یہ جانچنے کے لیے کہ میٹھا ہے یا کھٹا...... ملازمت کے لیے کسی ادارے کا رُخ کر لیا تو ہمیں جانچ پڑتال کے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے...... اگلے گریڈ میں ترقی کا فیصلہ بھی ہماری جانچ پڑتال کے بعد ہی کیا جاتا ہے...... بہو، داماد، کرایہ دار، خانساماں، مالی اور چوکیدار کا انتخاب بھی ہم جانچ پڑتال کے بغیر نہیں کرتے...... ظاہر سے متاثر بھی ہو جائیں تو باطن کی جانچ میں لگ جاتے ہیں انتخاب اگر بہو کا ہو تو اس کے حسنِ سلیقہ اور حسنِ اخلاق کی جانچ کے لیے وقت بے وقت اس کے گھر چھاپے مارتے ہیں (جیسے اس پر منی لانڈرنگ کا کیس ہو) یہ اور بات ہے کہ بہو بننے کے بعد وہ جی ہی جی میں یہ کہہ کر خوش ہوتی رہتی ہے کہ ہمیں آزمانے والے ہمیں آزما کے روئے! اگر ہم سے کوئی دوستی کر لے تو ہمارے دل میں اسے آزمانے کی خواہش کروٹیں لینے لگتی ہے۔

قطع نظر اس کے کہ ہم کس کس کو...... کب کب اور کیسے کیسے جانچتے اور پرکھتے ہیں ہوش میں آنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے فرشتے خود ہی کو ہمہ وقت جانچنے اور پرکھنے میں مصروف رہتے ہیں نہ جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہیں نہ قلم میں روشنائی بھرنے کیلئے ہی رکتے ہیں، مجال ہے جو ایک لمحے کے لیے بھی اپنا قلم روکیں۔ نہ صرف لکھتے ہیں بلکہ اس

ریکارڈ کو محفوظ بھی رکھتے ہیں تا کہ اپنے لکھے پر ہمیں پکڑ سکیں اور ہم اپنے کیے سے انکاری ہوں تو ہمارے ہاتھوں میں تھما دیں کہ لو...... آنکھوں سے دیکھ لو اپنا کیا دھرا......!

ہماری جانِ ناتواں پر فرشتوں کی یہ تعیناتی اس لیے کی گئی ہے کہ اس جہانِ رنگ و بو میں ہمارے نقل و حمل کی مکمل نگرانی کی جا سکے...... کہ ہم یہاں نہ سرکاری دورے پر آئے ہیں نہ اپنے خرچے پر (کہ گھومیں پھریں، سمیٹیں، بٹوریں اور چل پڑیں) ہمیں اپنی بصارتوں، سماعتوں، زبان اور نفس جیسے ساز و سامان کے ساتھ آسمان سے زمین پر بھیجا گیا ہے...... کہ ایک مدتِ معینہ تک یہاں وہ بس کر دیکھ لیں...... پھر...... دنیا سے گول......

چونکہ ہم جنت جیسی حسین جگہ سے نکالے گئے ہیں اس لئے اس دنیا کو بھی اتنا آراستہ و پیراستہ، گل رنگ اور دلنشین بنایا گیا ہے کہ ہمارا دل یہاں لگ جائے...... دل کے لگنے کے اتنے اسباب یہاں رکھے گئے ہیں کہ دل کا بچنا ممکن نہیں...... اتنے رنگ اور اتنے نظارے...... سب کے سب جاذبِ نظر اور پیارے...... نگاہ جدھر اٹھ جائے دل کا انہاک قابلِ دید ہو جائے...... کسی طرح کھینچ تان کر وہاں سے نکالو تو دوسرے میں گم ہو جائے...... سگریٹ کے ایک کش میں کتنا سُرور ہے۔ (کہ ایک بجھنے سے پہلے دوسری سلگا لی جاتی ہے) مگر سگریٹ کے ڈبے پر محکمہ صحت کی جانب سے ایک انتباہ درج ہوتا ہے کہ ''سگریٹ نوشی صحت کے لیے انتہائی مُضر ہے!'' یہ دنیا بھی سگریٹ کے ایک کش کی طرح ہے...... ایک کش لیتے ہی دوسرے کش کی خواہش ہوتی ہے...... کش پہ کش...... کشاکش...... دھوئیں کے پیچھے کی ہر چیز دھندلا جاتی ہے...... بس سُرور یاد رہتا ہے...... یہ دنیا اپنے دام میں ایسا جکڑتی ہے کہ پرکھنے سے پہلے اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ گرفتاری کا پروانہ آ چکا ہے...... ہماری جانچ مکمل ہو چکی ہے...... ہمیں پرکھا جا چکا ہے...... تمام شواہد جمع کر لیے گئے ہیں...... ہر کھوٹ کھنگالا جا چکا ہے...... ہماری ہر پستی تولی جا چکی ہے...... ہمارے یہاں بھیجے جانے کا مقصد پورا ہو چکا ہے...... ہماری آزمائش کر لی گئی ہے...... ہمارا امتحان لیا جا چکا ہے!

☆......☆......☆

فرحت طاہر

ہائے میرا بچپن

قارئین! اداریے میں توجہ دلانے پر فرحت طاہر نے کیسی اچھی پذیرائی کی، فوراً تازہ تحریر تخلیق کر دی۔ یعنی جینوئن لکھاری کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں، صرف محرک کی ضرورت ہوتی ہے (ص۔ا)

بچپن کا حساب کچھ یوں ہے کہ جوں جوں انسان پچپن کی طرف بڑھتا جاتا ہے بچپن زیادہ یاد آنا شروع ہوجاتا ہے۔ یوں تو ایک خاص دور کے بچوں کا بچپن تقریباً یکساں ہی ہوتا ہے مگر چونکہ ہر فرد منفرد ہے تو ہر ایک کی علیحدہ کہانی ہوگی۔ آج سے تین چار عشرے قبل کے بچے معصوم ہوا کرتے تھے مگر ہم کچھ زیادہ ہی تھے یا پھر شریر بھائیوں کی موجودگی کی وجہ سے بنا دیے گئے تھے۔

ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جو کچھ یوں ہے کہ اس وقت ہماری عمر سات آٹھ سال ہوگی، جب ایک دن صبح دادی جان نے ہمیں چونّی (آج کے بچوں کو کیا معلوم؟ ان کے لئے عرض ہے کہ چونّی ایک روپے کا چوتھائی یعنی چار آنے ہوتے تھے۔ آج کے دس روپوں کے ہم پلہ سمجھ لیں) دی کہ سامنے والے کھوکھے سے انڈے لے آؤ۔ ہماری باچھیں کھل اٹھیں اور اپنے پچھلے دن کے بارے میں سوچنے لگے کہ دادی کی یہ خاص مہربانی ہماری کس بات کا انعام ہے! جلدی سے sweetegg کا ڈبہ (یہ ہمارے بچپن کی خاص چیز تھی۔ میٹھی باریک انڈوں کی شکل کی گولیاں جو ایک موبائیل کے سائز کے ڈبے میں ہوتی تھیں۔ اس ڈبے پر چھتری تلے مرغی کی تصویر ہوتی تھی ہلانے پر میٹھے انڈے ہتھیلی پر گرتے تو بس...) کیا مصیبت ہے! بچپن کا حال لکھیں تو ہر چیز وضاحت کر کے بتائیں کہ آج وہ چیزیں ہی ناپید ہوگئیں) بھاگ کر لائے اور لان میں ہی بیٹھ کر کھانے لگے ایسا نہ ہو کہ برادران میں سے کوئی اچک لے اور خواہ مخواہ بٹوارا کرنا پڑے! بڑوں کی دھونس تو چھوٹوں کی ضد۔۔۔ دونوں ہی خطرناک تھے اس معاملے میں!

ڈبہ ختم کر کے جب اندر آئے تو دادی نے ہمارے خالی ہاتھ کو دیکھا اور انڈوں کا پوچھا تو صورت حال واضح ہوئی کہ وہ بیچاری آملیٹ کے لئے پیاز کاٹ کر منتظر تھیں کہ ہمارے آنے پر ناشتے کا انتظام ہو! جی نہیں! ڈانٹ نہ پٹائی کچھ بھی نہ ہوا ہاں مگر اپنا لطیفہ بنا اس وقت تو دلچسپ لگ رہا ہے مگر اس عمر میں تو رو رو کر برا حال ہوتا جب بھی ہنس ہنس کر یہ واقعہ سنایا جاتا۔

جہاں تک شوق کا معاملہ ہے ہر بچے کی طرح ہمیں بھی کہانیاں سننا بہت پسند تھا۔ دادی جان سال کا آدھا حصہ ہمارے گھر اور بقیہ آدھا بڑے ابّا کے گھر حیدرآباد میں گزارتی تھیں۔ بچوں اور بوڑھوں کی دوستی تو ویسے بھی ضرب المثل ہے کیونکہ ان دونوں اقوام کو ہی اصول وقواعد کے کڑے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے اور جو 'لوگ کیا کہیں گے!' کے بجائے 'جہاں اور جیسا ہے' کی پالیسی پر یقین رکھتی ہیں۔ لہذا ہم بھی اپنی دادی جان کا انتظار ان کے جاتے ہی شروع کر دیتے تھے۔ اہم ترین وجہ ان کی کہانیاں ہوتیں جو ہم رات کو ان کے بستر کے گرد بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔ چونکہ پڑھنے اور خصوصاً کہانیاں پڑھنے کے بہت شوقین تھے، اسلئے موسم اور حالات کی پروا کئے بغیر دیواروں پر لکھے اشتہارات تک بڑے غور سے پڑھتے۔ اس چکر میں بعض انہونی نہ ہوسکی کہ کئی دفعہ ہم بازار میں بچھڑتے بچے۔

نیک پریوں کی کہانیاں بے دریغ پڑھنے سننے کا نتیجہ تھا کہ ہم

عام زندگی میں بھی کہانیوں کی تکنیک استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔یعنی یہ دیکھ کر کہ برادران امی کو ستارہے ہیں۔۔۔کبھی بات نہ مان کرتو کبھی شرارتوں میں۔۔۔محلے والوں کی شکایتیں سن کر امی بے چاری پریشان ہورہی ہیں۔۔۔اس معاملے میں ہمارے نہ کوئی اختیارات تھے نہ حقوق۔۔۔نہ وسائل نہ طاقت۔۔۔!ہاں مگر ایک ہتھیار تھا۔۔۔قلم کی قوت!کسی پری کی طرف سے اپنے اس بھائی کے نام خط لکھتے جس نے کوئی نامعقول حرکت کی ہو۔مدعا یہ ہوتا کہ تم نے فلاں فلاں غلط حرکت کی ہے لہذا تمہیں میری طرف سے انعام نہیں ملے گا......اب آپ خود سوچیں ایک بری سی ہینڈ رائٹنگ میں بچگانہ اسٹائل میں کی گئی بات کتنے مزاح کا باعث بنتی ہوگی؟اس وقت آپ سے یہ شئیر کرنا اتنا برا نہیں لگ رہا مگر اس وقت بڑی شرمندگی کی بات لگتی تھی حالانکہ یہ تذکرہ ہماری تعریف میں ہی ہوتا تھا۔بذریعہ قلم اصلاح معاشرہ کے جراثیم ہمارے اندر گویا شروع سے ہی پائے جاتے تھے۔

بچپن کا ایک واقعہ جو یاد آتا ہے اس وقت کا ہے جب ہم جماعت سوم میں پڑھتے تھے۔ ہماری آرٹ ٹیچر نے اعلان کیا کہ آئندہ وہ ہمیں واٹر کلر سکھائیں گی۔ ہر بچے کی طرح ہمیں بھی ڈرائنگ سے بڑا شغف تھا۔لہذا گھر پہنچتے ہی امی کو یہ خوشی بھری اطلاع دی اور ساتھ ہی وہ فہرست بھی پکڑائی جو مس نے منگوائی تھی۔ پینٹ برش اور رنگ کے علاوہ رنگ گھولنے کے لئے پلاسٹک کے پیالے ، اپیرن اور فالتو کپڑے وغیرہ۔آج تو اس میں سے کوئی بھی چیز پہنچ سے باہر نظر نہیں آرہی مگر اس وقت واقعی بہت بڑی چیزیں لگ رہی تھیں۔ذرا آٹھ سالہ بچے کے ذہن سے سوچیں!اور صورت حال کچھ یوں تھی کہ ہم شہر کے مضافاتی علاقے میں رہتے تھے بارہ میل دور!جہاں آج کل بڑے بڑے شاپنگ سنٹرز، دفاتر اور تعلیمی ادارے ہیں وہاں گھنا جنگل تھا ہوا کرتا تھا سڑک کے دونوں جانب!نزدیک ترین شاپنگ سینٹر صدر ہوا کرتا تھا جہاں صرف اسٹاف بس کے ذریعے جایا جا سکتا تھا جو مقررہ اوقات میں ہی چلا کرتی تھی۔امی جان پہلی بس سے ہی ہمارا سامان لانے روانہ ہوگئیں۔

اس سامان کو دیکھ کر جو کیفیت ہوئی وہ آج بھی یاد ہے۔خوشی بھرا اضطراب!جیسے عید کا انتظار ہوتا ہے کپڑے اور جوتے سامنے رکھ کر! جب مطلوبہ پیریڈ شروع ہوا تو کچھ یوں منظر نامہ تھا کہ تقریباً پچیس بچوں اور بچیوں میں سے ہم واحد تھے جو پینٹنگ کا سامان لے کر آئے تھے باقی سب خالی ہاتھ سر جھکائے کھڑے تھے۔ٹیچر نے پوری کلاس کو نافرمان کا خطاب دیا اور ہمیں اپنی میز پر بلا کر ڈرائنگ سکھانے لگیں۔جس وقت وہ ہم پر تعریف کے ڈونگرے برسا رہی تھیں اسی وقت پرنسپل بھی کاریڈور سے گزریں۔ٹیچر نے انہیں بتایا تو وہ بھی ہماری کلاس کو ڈانٹنے لگیں۔اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت ذرا بھی فخریہ احساس نہیں تھا۔یوں تو اپنی تعریف ہر ایک کو پسند ہوتی ہے مگر اس طرح نمایاں ہونے میں انسان کتنا تنہا سا ہو جاتا ہے!!! کیا خیال ہے؟شام کو اپنے پڑوسی ہم جماعت کے گھر کھیل رہے تھے۔اس نے اپنی امی سے شکایت کی کہ مجھے رنگ کیوں نہیں منگوا کر دیئے آپ نے........!اور جناب ہمارے سامنے ہی اسکی بڑی بہن نے اس کے کان اینٹھے یہ کہہ کر ''تم خود کتنے خراب لڑکے ہو!تمہیں کچھ آتا بھی ہے!اس کو دیکھو کتنی اچھی بچی ہے ....''یقین کریں میرا دل چاہ رہا تھا میں اپنے رنگ اسے دے دوں!اب اس وقت کے درست جذبات تو ذہن میں نہیں ہیں مگر اب سوچتے ہیں کیا حقیقی تعریف کی حقدار میری امی نہیں تھیں جنہوں نے مجھے مطلوبہ چیزیں اہمیت کے ساتھ مہیا کیں؟؟آج ہم اس بات کا اظہار کر رہے ہیں مگر اس وقت تو یقیناً امی کا شکریہ ادا نہیں کیا ہوگا!

اس واقعے کا ڈراپ سین یہ ہوا کہ ہمارے چھوٹے بھائی نے جو ابھی اسکول نہیں جاتے تھے ایک دن موقع پا کر تمام رنگ خراب کر دیے۔

اسکول سے واپسی پر جب ہم نے دیکھا تو جو رونا شروع کیا وہ کئی دنوں بعد ہی ختم ہوسکا۔ یہ انسانی فطرت ہے جب کوئی نعمت ملتی ہے تو

اپنے آپ کو اس کا حق دار سمجھتا ہے اور جب چھن جائے تو واویلا کرتا ہے!

بچپن کی یادوں میں ایک اہم واقعے میں بچّھو کا شکریہ! یہ کیا با ت ہوئی یہ تو انسان کو تکلیف دینے والا شش پایہ ہے جو احسان کا جواب بھی ڈنک مار کر دیتا ہے اس کا شکریہ کیوں؟؟

قصہ کچھ یوں ہے کہ ہم سارے بچے اسکول بس کے ذریعے اپنے اپنے اسکول جایا کرتے تھے۔ یہ رواج تو آج بھی ہے کہ بچے شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں دور دراز جانے کی وجہ اسکولوں کا گھروں سے فاصلے پر ہونا ہوتا تھا اسٹینڈرڈ ہرگز نہیں تھے۔ تو جناب! ہماری ایک بس کی ساتھی نے ایک دن ہمیں بتایا کہ ان کے اسکول میں اردو پاکستانی فلم دکھائی جائے گی۔

اس زمانے کے بچوں اور نوجوان نسل کے لئے سینما جا کر فلم دیکھنا بہت بڑی تفریح ہوا کرتی تھی آج کی طرح نہیں کہ فلم just a click پر ہو! بہت سے خاندانوں میں یہ شجر ممنوعہ ہوا کرتی تھی۔ شیطان اس وقت بھی اپنے تمام حربوں کے ساتھ میدان میں ہوتا تھا لہذا مختلف تعلیمی اداروں میں اس کو دکھانے کا اہتمام کیا جاتا کہ کوئی محروم نہ رہے۔ ساتھی کی اس خبر پر ہمارا بھی بہت دل للچایا اور نہ جانے کس طرح امی سے اجازت اور ٹکٹ کے پیسے لئے یہ غیر ضروری بات ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ اس دن ہم اپنی دوست کے اسکول میں فلم دیکھنے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جوتا پہنتے ہوئے بری طرح تکلیف ہونے لگی جب ہمارا جوتا اتروایا گیا تو وہاں بچّھو صاحب آرام فرما رہے تھے اور ہمارے انگوٹھے پر ڈنک مار مار کر ہمارا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ آگے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں! ہمیں فوری طور پر ٹریٹمنٹ دی گئی۔ تکلیف اور فلم نہ دیکھنے کا افسوس ساتھ ساتھ رہے۔

یہ واقعہ پڑھ کر آپ کو یقین آ گیا ہوگا کہ ہم نے اس کا شکریہ درست ادا کیا تھا کہ اس نے ہمیں ڈنک مار کر فلم دیکھنے سے بچا کر نہ صرف ہماری معصومیت کو داغدار ہونے سے بچایا بلکہ سنت کے مطابق چیزوں کو جھاڑ کر استعمال کرنے کی عادت ڈلوائی۔

ہمارا بچپن ہمارے دور کی جھلک ہے! کیسا لگا یہ دور؟

☆......☆......☆

روشن آبگینے کی تقریب رونمائی

وسیع وعریض اسٹیج سفید روشنیوں سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔اسٹیج پر قد آدم بینر سب کی توجہ کا باعث ہے جس پر درج ہے ''روشن آبگینے، تذکرہ محسناتِ جماعت اسلامی'' یہ جماعت اسلامی حلقہ خواتین سے وابستہ مرحوم خواتین ارکان کے تذکروں پر مشتمل کتاب ہے۔

اسٹیج پر رکھی کرسیاں ابھی خالی تھیں البتہ جا بجا تازہ پھولوں کے قرینے سے سجے گلدان ان محسنات کے تذکرے کو گل رنگ کرنے کے لئے بے چین تھے۔اسٹیج پر لگے بینر پر غور کرتے ہوئے میں سوچنے لگی کہ اصل محسن تو جماعت اسلامی ہے جس نے مقصدِ زندگی سے روشناس کرایا ورنہ زندگی تو یوں بھی صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے، میں گزر رہی جاتی، یا اس سے اک قدم آگے بڑھ کر اس شکوے کے ساتھ بھی جام حیات کا یہ پیانہ لنڈھا ہی دیا جاتا ہے کہ عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا۔مگر یہاں ایسا نہیں۔اس چھاگل کے ہر قطرے کی اہمیت ہر وقت ازبر کرائی جاتی ہے۔اور اہم ترین اور انہونی بات یہ کہ ہم جنہیں بعد از مرگ محسن کہہ رہے ہیں وہ اپنی زندگی میں خود کو کبھی احسان کے درجے پر فائز سمجھنے والی شخصیات نہ تھیں۔ یہاں تو ہر ایک خود کو دہاڑی کا مزدوری سمجھتا ہے اور مزدور بھی وہ جو پسینہ خشک کرتے ہوئے دنیا میں کسی اجرت، کسی انعام و اکرام، کسی ترقی، کسی شہرت اور منصب کا طالب نہیں ہوتا بلکہ پسینہ خشک کرتے ہوئے آنکھیں بھی بھیگ بھیگ جاتی ہیں ان کی کہ مولا قبول کر لیجئے گا، رد نہ کیجئے گا، کھوٹ کا پردہ ڈھک دیجئے گا کہ آپ کی جناب میں تو زرِ خالص ہی مقبول ہے۔ان مسافرانِ حق کی صفوں میں کوئی لیڈر نہیں ہوتا اپنے حال و قال سے۔ یہاں سب کارکن ہوتے ہیں اپنی ذات میں۔البتہ دوسرے کے احسان کا اعتراف نہ کرنا کم ظرفی کی دلیل ہے۔

سو وہ جنہوں نے اپنی زندگی پر اس کے مشن کو غالب رکھا یقیناً قرآن نے انہی کے بارے میں گواہی دی ہے کہ اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا۔

اور انہی سوچوں کے بیچ آن کی آن میں اسٹیج کی خالی نشستیں مہمانوں سے سجتی گئیں اور اسٹیج کی رونق خوبصورت تلاوت قرآن کریم سے دوبالا ہوگئی۔ہم اپنے بارے میں جو بھی اجتماعی رائے رکھتے ہوں وہ ایک دائرے کی بات ہے۔اسٹیج پر بیٹھی خواتین مہمانوں کی ترتیب یہ بتا رہی تھی کہ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ سماج ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔کیا ہمارے سرکل سے ہٹ کر بھی لوگ ان دنیا سے گزر جانے والی شخصیات کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتے ہیں؟اور جوں جوں مہمان مقررین کی گفتگو میں سنتی گئی مجھ سمیت شاید بہت سے یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اکثر خوبیوں کا اعتراف کرنے میں ہم کسرِ نفسی سے کام لیتے ہیں لیکن سماج کے دوسرے دائروں کے لوگ زیادہ کشادہ دلی سے اعتراف کرتے ہیں چاہے وہ نظریاتی حوالوں سے ہم آہنگ نہ بھی ہوں۔جن کو ہم جماعت اسلامی کی محسنین کہہ رہے تھے ان سب نے باور کرایا کہ وہ صرف جماعت اسلامی کا نہیں اس سماج کا اثاثہ تھے۔ان کی گفتگو خود ان کے لفظوں میں سنئے۔

ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر طلعت وزارت جن کی پیرانہ سالی ان کے لہجے سے کوسوں دور ہے فرما رہی ہیں کہ ''لوگ واقعی عظیم کام کر کے جاتے بھی ہیں دنیا سے مگر ان میں سے اکثر اپنی ذات، ادارے یا شہرت کے لیے کام کرتے ہیں۔ میں نے اس کتاب کو بغور پڑھا، میں ایسے کم لوگوں کو جانتی ہوں جو اپنی ذات کی نفی کر دیں اور اپنے ذاتی مفاد کو اجتماعی

مفاد میں گم کر دیں۔ چاہے کسی بھی مکتبہ فکر کا فرد ہو وہ ان خواتین کی سرگزشت پڑھ کر متاثر ضرور ہوگا۔ جب میں نے اس عمر میں ایک نیا حوصلہ پایا تو نوجوان نسل کے سیکھنے کے لئے کتنا کچھ موجود ہے ان خواتین کی زندگیوں میں...... ایسے مخلص لوگ جنہوں نے اس معاشرے کی برائیوں کا صرف نوحہ نہیں کیا بلکہ جسم و جان کی بہترین قوتیں اور وقت خیر کے فروغ کے لئے صرف کیا۔ سماج کے ایک بڑے طبقے کو ان کی ان گرانقدر خدمات کا علم تک نہیں ہے۔ میں گزر جانے والوں اور اپنے اطراف میں موجود آپ سب کی مخلصانہ کاوشوں کو خراج تحسین پیش کرتی ہوں۔''

لفظوں کی سچائی ساعتوں سے ہوتی ہوئی دل کے تاروں پر دستک دیتی ہے۔ وسیع و عریض ہال میں موجود سینکڑوں خواتین نے ان لفظوں کی سچائی کو محسوس کیا۔ ہال کے بائیں جانب خصوصی نشستوں پر بیٹھے ہوئے ان محسن خواتین کے اہل خانہ کے علاوہ بھی ہر اک، ایک ولولہ تازہ پا رہا تھا اپنی محسنین کے اس تذکرے میں۔

شیخ زائد اسلامک سینٹر جامعہ کراچی کی پروفیسر جہاں آرا لطفی جوان خواتین کے لئے آٹھ صفحات پر مشتمل خراج تحسین تیار کر کے لائی تھیں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں سمجھتی ہوں کہ اس کتاب میں موجود شخصیات کے کردار پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات لکھوائے جائیں، وومن اسٹڈی سینٹر یونیورسٹیوں میں جہاں جہاں بھی ہیں اس کتاب کو اپنے نصاب میں شامل کریں۔ یہ خواتین جن کو کوئی حکومتی فنڈ نہیں ملے، جنہوں نے اقتدار کے ایوانوں میں جانے کے خواب دیکھنے کے بجائے سماج کی حقیقی تبدیلی کے لئے بے غرض کام کیا۔ مجھے تو اس کتاب سے علم ہوا کہ کچھ خواتین نے عربی زبان کے فروغ کے لئے گرانقدر خدمات سرانجام دیں تو کسی نے گاؤں گوٹھوں میں مدارس کے جال بچھا دیئے۔ ام زبیر نے صرف نظام تعلیم پر تنقید نہیں کی بلکہ زبیر پبلک اسکول قائم کر کے نسل نو کی تربیت کا بیڑہ اٹھایا۔ بنت الاسلام اصلاح معاشرہ کے لئے قلم کو حرکت میں لائیں اور دوسری کتب کے علاوہ ''زندگی بے بندگی شرمندگی'' کے عنوان سے ایک عظیم علمی ذخیرہ چھوڑ کر گئیں۔ بنتِ مجتبیٰ مینا کی شاعری میں ان کے دل کی دھڑکن آج بھی سنی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر عذرا بتول نے تو کسی عظیم الشان انسٹی ٹیوشن سے بڑھ کر کام کیا تن تنہا اپنی مساعی سے۔ جتنی خواتین کا تذکرہ ہے وہ سب پہاڑی کے چراغوں کے مترادف ہیں۔

منتظمین نے محدود کارڈز جاری کیے تھے تقریب میں مدعوئین کو۔ مگر مہمانوں کی کثرت بتا رہی تھی کہ اسلاف کی محبت کسی دعوت نامے سے بالاتر چیز ہے ہر ایک کھنچا چلا آرہا تھا اور بار بار نشستوں کی تعداد بڑھوائی جا رہی تھی مگر کوئی بدانتظامی نہیں کیونکہ جن کی یاد میں یہ محفل سجائی گئی تھی وہ بڑی نظم وضبط کی زندگیاں گزار کر گئی ہیں۔ اور ان کی یاد میں رکھی گئی یہ تقریب اتنی ہی شائستہ اور پروقار ہونا چاہیے تھی۔

صحافی اور پروڈیوسر صفیہ ملک نے برجستہ اور فی البدیہہ جملوں سے محفل کو زعفران زار بنائے رکھا۔ انہوں نے کتاب میں موجود ان شخصیات کا خصوصی ذکر کیا جن کو وہ ذاتی طور پر جانتی تھیں اور عینی شہادت پیش کرتے ہوئے کہا کہ امی جی (کرم النساء) کے گھر میں کئی بار گئی ہوں۔ اپنے تین کمروں کے گھر میں سے آدھا کمرہ انہوں نے اپنے اہل خانہ کی ضروریات کے لئے رکھا تھا اور باقی پورا گھر ویلفیئر سینٹر بھی تھا اور مدرسہ بھی۔ دن کا کوئی وقت نہیں ہوتا کہ دروازہ بند ہو پائے حفظ، ناظرہ، فہم القرآن کتنی طرح کے کورسز وہ بچوں بچیوں کو کروا دیتیں۔ خود بھی پرانے کپڑے گھر گھر سے اکٹھی کرتیں مفت بازار لگواتیں تو انہی سے جہیز بکس تیار کراتیں، مستحقین کا رش لگا رہتا اور کسی کو خالی ہاتھ لوٹانا ان کے بس کی بات نہ تھا۔ میں سوچتی تھی کوئی دن، دن کا کوئی حصہ انہوں نے اپنے لئے تو رکھا ہی نہیں۔ 96 سال کی عمر میں صرف آخری دو برس بستر پر گزارے۔ بیگم صلاح الدین کی یادیں وہ ایک جذبے سے تازہ کرتی رہیں کہ ان کا صبر اور استقامت کوئی افسانوی چیز معلوم ہوتا ہے۔ ان کی

رفاہی خدمات پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی تھیں۔ وہ بولیں کتاب کے سرورق پر محسنات جماعت اسلامی کا لکھا دیکھا تو سوچا کہ میرا بھی نام کسی کتاب میں آئے پھر دیکھا تو پتہ چلا کہ کتاب میں ذکر آنے کے لئے تو مرنا پڑے گا۔ مرنے سے نہیں ڈرتی......مگر میں مر کے بھی جماعت اسلامی کی محسنہ تو نہیں بن سکتی۔ یہ تو پتھر کا جگر چیرنے کے مترادف ہے۔ مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ۔ پھر سوچا کہ جو میں کر رہی ہوں اسی کو اللہ قبول کر لے۔ ان عزیمت کے راستوں پر چلنا کہاں ہر ایک کے بس کی بات ہے۔

اسٹیج سے تقاریر جاری تھیں اور مجمع دم بخود۔ بس ایک خوشبو تھی جو چہار سمت پھیلی ہوئی تھی۔ ان گل عذار خواتین کے کردار کی خوشبو!

قلمکار و ہمدرد شوریٰ کی رکن، سونولوجسٹ، ڈاکٹر رضوانہ انصاری حیدرآباد سے اس تقریب میں شرکت کے لئے بطور خاص تشریف لائیں۔ ان کی جچی تلی گفتگو چند جملوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے کہا کہ کتاب پڑھتی گئی اور کم مائیگی کا احساس دامن تھامے رہا۔ البتہ کتاب کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے وہ کم مائیگی کا احساس ایک عزم میں ڈھل جاتا ہے۔ سب سے بڑی بات اس کتاب میں اشرافیہ سے متعلق خواتین کے تذکرے نہیں ہیں۔ کچھ کے پاس بڑی بڑی ڈگریاں بھی نہیں تھیں مگر بڑے بڑے اداروں سے زیادہ انہوں نے معاشرے کے لئے خدمات انجام دیں۔ یہ سچی مومنات کی کہانیاں ہیں جو ہر قاری کے جذبے کو جنوں کر دینگی۔ میں خود سے ایک سوال کرتی رہی کہ میں ہوں......مگر ان جیسی کیوں نہیں...... یہ روشن آ بگینے نہیں کیونکہ آ بگینہ تو نازک ہوتا ہے، یہ تو روشن حدیدی چراغ ہیں۔ میں نے ان کی زندگیوں سے سورۃ والعصر کا فہم حاصل کیا۔ اس کتاب نے عورتوں کی عزت وتوقیر کا ایک نیا باب رقم کیا ہے۔

دوران پروگرام اسٹیج کے ساتھ رکھی بڑی سلائیڈ پر جماعت اسلامی حلقہ خواتین کے شعبہ جات اور ذمہ داران کے تعارف چلتے رہے۔ مختلف اہم مواقع پر جماعت اسلامی کی سماجی خدمات کی تصویری جھلکیاں دکھائی جاتی رہیں۔

سمیحہ راحیل قاضی لاہور سے تقریب میں شرکت کے لئے ایئر پورٹ سے براہ راست تقریب میں پہنچیں۔ پشتو لہجے میں میٹھی اُردو بولتی ہیں۔ بولیں کہ قوموں کی ہو یا تحریکوں کی، تاریخ ایک حافظہ ہوتی ہے اور جن کا حافظہ جاتا رہے ان کو مجنوں کہا جاتا ہے۔ اپنے محسنین کو ہم دعاؤں میں بھی یاد رکھتے ہیں، اجتماعی فورمز پر بھی ہمارے دل ان کے احسان کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ جماعت اسلامی کا جو تن آور درخت آج الحمدللہ ہم دیکھ رہے ہیں اس کے بیج ان نابغہِ روزگار ہستیوں نے اپنے ناخنوں سے مٹی کھود کر لگائے۔ یہ زمین کے نمک کے مترادف ہستیاں تھیں، ان کے نقوش پا ہمارے لئے سنگ میل ہیں۔

مسلم لیگ فنکشنل کی رہنما شہناز جمیل نے صرف چند جملے ادا کئے لیکن ان کے ادا کئے ہوئے جملوں کی آخر تک بازگشت سنائی دی۔ وہ بولیں جب لڑکیاں رخصت ہونے لگتی تھیں تو گھر کی بزرگ عورتیں ان کو جہیز میں بہشتی زیور کتاب بہت اصرار سے دیا کرتیں تا کہ وہ خانگی زندگی کو حسن اور سلیقہ سے گزارنا سیکھیں۔ جن لوگوں نے اسی حسن اور سلیقے سے اپنی زندگیاں گزاریں یقیناً وہ بہشتی زیور کی عملی تفسیریں ہیں۔ میں نے ان خواتین اسلام کا ذکر پڑھا اور میری یہ خواہش ہوگی کہ اب مائیں اپنی بیٹیوں کو جہیز میں ''روشن آ بگینے'' ضرور دیں یہ سماج کے ہر گھر کی ضرورت ہے۔ سابقہ ایم این اے عائشہ منور صاحبہ نے اب تک ہونے والی تمام تقاریر کا خلاصہ چند جملوں میں سمو دیا اور کہا کہ جماعت اسلامی سے وابستہ افراد کی زندگیوں میں جو خیر نظر آتا ہے یہ ذاتی محاسن سے زیادہ ہمارے اجتماعی نظام اور نظام تربیت کا مرہونِ منت ہے۔

سربراہ حلقہ خواتین محترمہ دردانہ صدیقی نے اپنی جامع گفتگو میں جماعت اسلامی حلقہ خواتین کے سماجی کردار پر روشنی ڈالی۔ اس کی پرعزم خواتین مختلف شعبہ جات میں جس طرح خیر کے فروغ کے لئے شبانہ روز

مصروفِ عمل ہیں ان کی ہلکی سی جائزہ رپورٹ پیش کی۔ قبل ازیں روبینہ فرید جو اس نادر تصنیف کی مُرتبہ ہیں، انہوں نے اپنے دھیمے لہجے والی گفتگو میں کتاب کا مکمل تعارف پیش کیا اور کہا کہ ان خواتین نے اس وقت دین کی دعوت اور اسلام کے مکمل نظامِ زندگی ہونے کے تصور کو پیش کیا جب چند عبادات اور رسوم کو پورا دین سمجھا جاتا تھا۔ آج جماعت اسلامی پاکستان میں خواتین کی سب سے بڑی اور منظّم تنظیم ہے جو ہر طبقہ فکر کی خواتین کو دین کا پیغام پہنچانے کے لئے کوشاں ہے اور یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ جذبے کو جنوں کیسے بنایا جاتا ہے، بیج کس طرح ڈالتے ہیں، درختوں کی آبیاری کیسے کرتے ہیں، مقصد کا حصول پیشِ نظر ہو تو اوقاتِ کار کی تقسیم کس طرح کی جاتی ہے، دلوں میں گھر کرنے کے گُر کیا ہیں اور عزیمت کی راہ پر چلنے کا فن کسے کہتے ہیں۔ صاحبِ عزیمت انسان کا دل آتشِ عشق سے سلگتا رہتا ہے۔ دلوں میں پھوٹنے والا جذبہ سنگلاخ زمینوں میں بھی اپنی نمو کی راہیں نکال لیتا ہے۔ ایمان کی خوشبو مومن کو سراپا الفت بنا دیتی ہے۔ یہ کتاب ان اکابرین کی خوشبو آنے والی نسلوں میں منتقل کرتی رہے گی۔ کتاب میں ماضی اور حال میں دنیائے فانی سے کوچ کرنے والی 19 خواتین کے تذکرے موجود ہیں۔

سورج کے سائے ڈھلنے لگے اور جب ایسا ہو تو خواتین کی گھروں سے دوری بے چینی میں بدلنے لگتی ہے۔ یہ تاریخی پروقار تقریب دعا اور بعد ازاں لذتِ کام و دہن کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ دو گھنٹہ کی اس تقریب کی خوشبو تا دیر یادوں کو مہکاتی اور جذبوں کو مہمیز دیتی رہے گی۔

اختتامِ تقریب پر ایک پیغام ذہن پر نقش ہو چکا تھا کہ :

اپنے ادوار کی تاریخ بنانے کے لئے

اپنے اسلاف کی تاریخ سے نسبت رکھنا

☆......☆......☆

سیما ملک ۔ جدہ

کانٹا ہو تو ایسا ہو

بہت پہلے ایک دن فوزیہ ناہید سے بات ہو رہی تھی تو انہوں نے کہا کہ جانے والوں کے لیے گواہیاں لکھ کر دینی چاہئیں۔ یہ انکا حق بھی شاید بنتا ہو۔

سو آج ایک گواہی اسی لیے '' بتول '' کے ذریعے، پڑھنے والی ساتھیوں تک کہ شاید اسطرح ہم جانے والوں کے لیے تھوڑا سا سرمایہ جمع کر لیں ایک صدقہ جاریہ کی صورت میں۔ پیارے بیٹے احمد آج تمہارا یہ قرض اتارنے کی کوشش ہے۔

انسانی زندگی میں کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کا سارا منظر بدل دیتے ہیں اور وہ اتنے قریب سے۔ اتنے اچانک نکل کر سامنے آتے ہیں کہ دل دھڑکنا بھول جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک لمحہ وہ تھا جب فون کی گھنٹی بجی اور ایک ایسی خبر ملی کہ یا تو وہ سمجھ میں آئی نہیں یا دل نے سمجھنا چاہا نہیں۔

میں امریکہ میں اپنی بھانجی کی شادی میں شرکت کرنے گئی ہوئی تھی۔ شادی سے دو دن پہلے پتہ چلا کہ بہت عزیز جان ساتھی، دوست، بہن (اور سب ہی کچھ) فاطمہ رعنا، کا جوانِ رعنا......احمد......ہمیں بہت سہولت سے چھوڑ کر چل دیا ہے۔ وہ سونے لیٹا اور اس کے پیارے رب نے اسے بہت پیار سے تھپک کر سلا دیا ہے۔ ایسے کہ اب جاگنے کی ضرورت اور خواہش دونوں نہیں۔ سب کچھ بدل چکا تھا۔ سارا منظر نامہ وہی تھا لیکن کچھ بھی وہ نہیں تھا۔

احمد ایک ایسا بچہ جس سے میں اسکی پیدائش کے اگلے دن پہلی بار لیاقت نیشنل ہسپتال میں ملی۔ یوں تو سارے ہی بچے پیارے ہوتے ہیں لیکن اگر وہ اپنے بہت پیاروں کے ہوں تو مزید پیارے لگتے ہیں۔ تو احمد بھی ایسے ہی تھا۔ بہت پیارا سا ایک گڈا۔ وقت گزرتا رہا اور دور دور رہنے کی وجہ سے ملاقاتیں کم کم رہیں۔

ایک بار پھر جب اس سے ملاقات ہوئی تو اسکے جس رویہ نے مجھے چونکا دیا اور آج تک نہ بھولنے دیا وہ یہ کہ ہم انکے گھر ملنے گئے تھے، احمد بارہ سال کا تھا اس کے والد سعودی عرب میں مقیم تھے اور وہ خود اپنے بھائی اور امی کے ساتھ کینیڈا میں، وہ غالباً اٹھارہ منزل لفٹ کے ذریعے ہمیں نیچے چھوڑنے آیا، خدا حافظ کہنے کے لیے۔ کیونکہ ہم اس کے مہمان تھے، اسکی امی کی دوستی کے حوالے سے، اور وہ ساتھ ساتھ کہتا گیا۔ سیما خالہ آپ کا آنا بہت اچھا لگا، بہت خوشی ہوئی! اور میں سوچتی رہی۔ حیرت کیساتھ کہ اسمیں یقیناً ماں کی تربیت کا بہت ہاتھ ہوگا، لیکن خود احمد کی شخصیت اور طبیعت اس سے زیادہ تھی۔ اس عمر کے بچے عموماً مہمانوں کو رخصت کرنیکی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ بہت محبت کرنے والا۔ آگے بڑھ کر گرم جوشی کا اظہار کرنے والا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رعنا کے گھر فون کیا ہو، احمد نے اٹھایا ہو اور وہ فون اپنی امی کو تھما دے۔ وہ ضرور رک کر خیریت پتہ کرتا تھا سب بچوں کی میری ایک ایک کا نام لے کر!!

احمد کا دل اُمت کے لیے بے چین ہوتا تھا۔ مجھے ایک خاتون کی بات شاید کبھی نہ بھولے کہ جب انہوں نے بتایا کہ احمد اور انکا بیٹا پانچویں کلاس میں کینیڈا میں ایک ساتھ تھے اور کلاس میں انکے بیٹے کو احمد نے بتایا کہ اس ملک میں حیا کی حفاظت کیسے کی جاتی ہے۔ وہ اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ بھی بہترین معاملہ کرنے والا تھا پڑوس میں رہنے والے عیسائی پادری کا کہنا تھا کہ ہم اسکے لئے دعا کرینگے۔ یہ اور بہت سی اور گواہیاں احمد بیٹے! کہ جو ضرور تمہارے لیے اور تمہارے والدین کے لیے تمہاری طرف سے صدقہ جاریہ بنیں گی انشاء اللہ۔ تمہاری چچی جان (کہ جن کے بچے نہیں ہیں) کا کہنا تھا کہ تم نے ہمیشہ انہیں تسلی دی کہ بالکل فکر نہ کریں میں جو ہوں!! پچھلے سال میرے بیٹے اور بہو احمد اور انس سے ملنے انکے گھر گئے اور رعنا دمام میں تھیں۔ بچے حیران رہ گئے کہ صبح جب وہ سو کر اٹھے تو ناشتہ کی میز بالکل تیار تھی۔ نبی کریمؐ کے ذریعے ہمیں معلوم ہے کہ یہ انسان کے ایمان کی علامت ہے کہ وہ اپنے والدین اور اپنے دوستوں کا اکرام کرے۔

یہ عمر اور یہ انداز اپنے رب کو بھی بھا گیا۔

لوگ یہ تمنا کرتے ہیں اور برحق کرتے ہیں، اپنی عافیت سمجھ کر کرتے ہیں کہ جب ہم چلے جائیں تو ہمارے بچے ہمارے لیے مغفرت کی دعا کریں،ہمیں زندگی میں بچوں کا کوئی دکھ نہ دیکھنا پڑے۔حالانکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بچے ماں باپ کو غالباً جلدی بھول جاتے ہیں۔اسلیے کہ ان کی اپنی دنیا ہوتی ہے،اپنی زندگی ہوتی ہے،اس کے جھمیلے ہوتے ہیں۔چوٹ تو زبردست لگتی ہے۔۔لیکن سہلانے سے مدھم بھی ہوجاتی ہے۔ایک کسک رہ جاتی ہے۔۔لیکن احمد بیٹے!تم نے عجب سودا کیا،خود اپنے لیے بھی اور اپنے والدین کے لیے بھی۔ اپنے لیے بے شمار دعاؤں کے دروازے کھول گئے۔اور والدین کے لیے وہ آزمائش دے گئے جس ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو آزمایا۔اپنے محبوب ترین بندے محمدؐ کو آزمایا۔

بھلا بوڑھے ماں باپ بھی کہیں جوان اولاد کو بھول سکتے ہیں؟ بھلا والدین کی دعا بھی اولاد کے حق میں رد ہوسکتی ہے؟ بھلا ماں کے زخمی دل کے احساسات سے بھی رب ناواقف رہ سکتا ہے؟ بھلا دل سے نکلی دعا بھی واپس لوٹائی جاسکتی ہے؟اور بھلا اس دکھ پر صبر کرنے پر’’بیت الحمد‘‘سے کم کچھ ملے گا؟نہیں اور بالکل نہیں انشاء اللہ کہ رب کا وعدہ سچا ہے اور ہمیں اس پر ایمان ہے۔

تو سنو رعنا!میری جان!اللہ نے تم سے ایک امانت جو بہرحال اس کی تھی،واپس ضرور لی ہے لیکن اس وعدے پر کہ انشاءاللہ تم اسکے لیے درجات میں اضافہ کا سبب بنو اپنی دعاؤں کے ذریعے۔اور وہ تمہارے لیے درجات میں اضافہ کا سبب بنے،صبر کا اجر سمیٹ کر۔اور ایک ایسی جگہ ملنے کی تیاری کرو کہ جس میں نہ تنہائی ہے،نہ دکھ،نہ علیحدگی،نہ رنج،نہ بیماری اور نہ موت۔

آج کی دنیا میں احمد جیسے بچے ذرا کم کم ہی ہوتے ہیں،جو ہر ذی روح سے ٹوٹ کر محبت کریں،جو رشتہ داریاں نبھائیں،جو اپنے والدین کے دوستوں کے ساتھ احسن معاملہ کریں،جو پڑوسیوں کا خیال رکھیں،جو اپنے بہن بھائیوں کے بہترین دوست ہوں،جو اپنے والدین سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہوں۔جن کے جانے سے ایک زمانہ ہل کر رہ جائے،جنہوں نے اس دنیا میں اپنا حصہ تھوڑا رکھا ہو۔جن کے جانے کے بعد دور دراز سے لوگ گواہیاں دینے آئیں۔جانا تو ہم سب کو ہے اور یہی ایک حقیقت ہے۔لیکن ایک وہ جانا ہے کہ لوگ جان بھی نہ سکیں کہ کون آیا تھا اور کون چلا گیا۔اور احمد بیٹے!ایک وہ جانا ہے کہ ایک اکاؤنٹ کھل گیا دعاؤں کا......تمہارے لیے،تمہارے والدین کے لیے،اور انس کے لیے۔!جاؤ بے پناہ پیار کرنے والے رب کی پناہ میں۔کہ اب روزِ قیامت اسکی بہترین جنتوں میں ملاقات ہوگی۔انشاءاللہ

اے اللہ۔ ہمارے عظیم ربّ! آپ ہماری گواہیاں احمد کے حق میں قبول کر لیجیے اسکی بہترین میزبانی فرمایئے، اسکے لیے بہترین گھر جنت الفردوس میں بنا دیجیے۔اور جہاں وہ اس وقت ہے اس جگہ کو اسکے لیے ماں کی گود کی طرح شفیق بنا دیجیے۔اور اے اللہ پاک ربّ! آپ میری دوست،محسن اور ساتھی رعنا اور اسکے گھر والوں اور پیاروں کے دل کو سکینت عطا کر دیجیے۔ اسکے دل کو قرار دے دیجیے۔اسکے دل پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے تھام لیجیے۔اسکے لیے جنت میں’’بیت الحمد کا فیصلہ کر دیجیے۔اس پر صبر کا فیضان کر دیجیے۔اور اس دکھ کو اس کے لیے قوت بنا دیجیے!کہ اس گداز کو وہ دنیا میں تقسیم کر سکے اور اے عظیم ربّ اسکے علاوہ بھی بہت کچھ کہ جو دل میں ہے اور تو اسے جانتا ہے۔

احمد بیٹے۔!ہمارا دل تمہاری یاد سے بے چین ہے کہ یہ محبت بھی اللہ ہی کی دی ہوئی ہے،لیکن زبان وہی کہے گی جو اللہ کا حکم ہے۔

’’انا للہ وانا الیہ راجعون اللھم اجرنا فی مصیبتنا واخلف لنا خیراً منھا‘‘

اللہ کا ارشاد ہے،اور آج یہ بہت اچھا سمجھ میں آیا ہے۔

وَعَسَىٰٓ اَن تَكرَهُوا شَيْئاً وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُم وَعَسَىٰٓ تُحِبُّوا شَيْئاً وَهُوَ شَرٌّ لَّكُم
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنتُم لَا تَعلَمُونَ (البقرہ ۲۱۹)

مومن کو ایک کانٹا بھی چبھتا ہے تو وہ اسکا اجر سمیٹتا ہے۔تو احمد بیٹے تمہارا جانا ایک ایسا کانٹا ہے جو مستقل چبھن بن گیا ہے۔ایک رستا زخم ہے لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ ہر ٹیس پر وہ ہمیں اجر دیگا۔انشاء اللہ اور ہر ٹیس پر تم دعا لو گے کہ ربّ تمہیں جنت الفردوس عطا فرمائے اور وہاں کی حوروں سے تمہارا بیاہ کر دے۔آمین۔

اور میں نے سوچا......

لندن برج پر چلتے ہوئے مجھے اچانک اپنی اسکول لائف یاد آگئی جب ایک دن انگلش کلاس میں اس نظم "London bridge is falling down my fair Lady" کو پڑھتے ہوئے میں نے خواہش کی کہ کاش کبھی میں بھی اس پل پر سے گزروں اور پھر میں اس بات کو بھول بھال گئی لیکن میں یہ نہ جانتی تھی کہ قبولیت کی اس گھڑی میں میری یہ خواہش پوری ہونا قرار پا چکی تھی۔ پل پر چلتے ہوئے میں نے کئی مرتبہ اپنے رب کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری اتنی معمولی سی خواہش کو بھی رد نہ کیا۔ اور میں نے سوچا کہ میری وہ خواہش جسے میں بھولی رہی لیکن میرا رب اسے نہ بھولا تھا اچانک مجھے وہ حدیث یاد آگئی جس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ نے فرمایا ''اگر کوئی شخص اللہ سے دعا کرتا ہے تو اس کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے خواہ دنیا میں ہی اسے وہ چیز جلدی عطا کر دی جائے یا اسے اس کے لئے آخرت میں ذخیرہ بنا دیا جائے، یا پھر اس دعا کے بقدر اس کے گناہ اس سے دور کر دیئے جائیں۔ بشرطیکہ اس کی دعا کسی گناہ یا قطع رحمی کے لئے نہ ہو اور وہ جلدی نہ کرے، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! جلدی سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: وہ یہ کہے کہ میں نے اپنے رب سے دعا کی لیکن اس نے قبول نہ کی (سنن الترمذی: ۸۶۹۳)۔ واقعی ہمیں ہمیشہ اپنے رب سے دعائیں مانگتے رہنا چاہیئے بیشک وقتی طور پر وہ قبول ہوتی نظر نہ آئیں پھر بھی مانگتے ہی رہنا چاہیئے کیونکہ ہمارا مانگنا کبھی رد نہ ہوگا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ آپکی نذر کر رہی ہوں۔ مارچ کے آغاز کے ساتھ ہی جگہ جگہ سڑک کے کنارے مختلف رنگوں کے پھولوں کی کونپلیں نظر آنا شروع ہوگئی تھیں اور 2 مارچ کے بعد تو اکثر جگہوں پر بے شمار پھول نظر آنے لگے اور صبح سویرے انہیں دیکھ کر دل خوش ہو جاتا تھا اسی دوران ایک جگہ جانے کا اتفاق ہوا۔ دریا کے کنارے درختوں کے نیچے دور تک پھیلے پیلے رنگ کے بے شمار پھول نظر آئے۔ میں نازیہ سے پوچھے بنا نہ رہ سکی کہ یہ کونسے پھول ہیں جو اتنے خوبصورت ہیں؟ اس نے کہا یہ ڈیفوڈلز ہیں۔ پھر زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولی یاد ہے نویں کلاس کی انگلش کی کتاب میں ولیم ورڈزورتھ کی نظم جو اباجی آپ کو یاد کراتے تھے اور آپ رٹے لگاتی نہ تھکتی تھیں مگر آدھی نظم سے زیادہ کبھی یاد نہ کر پاتی تھیں اور اباجی آپ کو ترجمہ بتاتے جاتے تھے۔ آپ کو تو وہ نظم یاد نہ ہوئی مگر ہمیں ضرور ہوگئی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ میں وہ نظم کیسے بھول سکتی ہوں کیونکہ اسے پڑھتے ہوئے میں اکثر اپنے تصورات میں کھو جاتی تھی اور اس لیے بھی پوری نظم یاد ہی نہ کر پائی تھی۔ آج ان پھولوں کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر وہ نظم اپنے ترجمے سمیت میرے ذہن میں گھوم گئی تھی۔ شاعر کی طرح میرا دل بھی سینکڑوں کی تعداد میں لہلہاتے ان پھولوں کو دیکھ کر خوشی سے بھر گیا تھا۔ زبان سے سبحان اللہ ہی نکل رہا تھا۔ اور سورہ الرحمان میں کئی مرتبہ دہرائی جانے والی یہ آیت میرے ذہن میں آگئی ''پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے'' اور میں نے فوراً ہی سوچا ''اے میرے رب میں تیری کسی بھی نعمت کو نہیں جھٹلاتی''۔

آج 24 مارچ کو مجھے لائبریری جانے کا اتفاق ہوا۔ موسم بڑا دلکش تھا پچھلے دو دنوں سے سورج خوب چمک دمک کے ساتھ نکل رہا تھا۔ آج بھی خوب روشن دن تھا۔ اگرچہ ایسٹر کی چھٹیاں شروع تھیں لیکن مجھے لائبریری جانا ضروری تھا۔ واپسی پر بس میں چڑھی تو نیچے کے حصے میں کافی رش ہونے کے باعث ڈبل ڈیکر بس کے اوپر والے حصے میں جا کر بیٹھ گئی۔ ۵ منٹ کے بعد دیکھا تو چمکدار سورج کی روشنی میں خوب موٹے

موٹے اولے گرتے نظر آئے۔ مجھے یقین نہ آیا کہ اتنی تیز دھوپ میں اولے کیسے گر رہے ہیں۔ میں مسلسل بے یقینی کی حالت میں دیکھتی رہی۔ تقریباً ۲۱ منٹ تک اولے گرتے رہے اور یقین جانیں کہ اگر میں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر نہ دیکھا ہوتا تو شاید کسی کے کہنے پر میں نہ مانتی۔ اور پھر میں نے خود سے سوال کیا کہ اگر یہ بات مجھے کوئی ایسا شخص بتاتا جس کے بارے میں مجھے یقین ہوتا کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا تو کیا میں پھر بھی یقین نہ کرتی۔ اور مجھے خیال آیا کہ ایسی صورت میں میں ضرور اس بات کو مان جاتی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سوچا کہ 14 سو سال پہلے جب اہلِ مکہ کو آپ نے اللہ کا پیغام دیا تو انہوں نے آپ کی بات کیوں نہ مانی حالانکہ آپ 4 سال سے ان کے درمیان تھے اور 'صادق' اور 'امین' مشہور تھے۔ اور میں نے سوچا وہ تمام اہلِ مکہ جنہوں نے آپ کو جھٹلایا وہ کس قدر بدنصیب تھے کہ انہوں نے سب سے سچے انسان کی بات پر یقین نہ کیا۔ اور آج بھی جو شخص قرآن اور آپ کو جھٹلاتا ہے وہ اس دنیا کا سب سے بدنصیب انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو حق جاننے اور ماننے والا بنائے۔ آمین۔

☆......☆......☆

میں علم کیوں حاصل کروں؟

حضرت انسان کو اللہ تعالیٰ نے بولنے اور لکھنے کی دو ایسی صلاحیتیں دی ہیں جو اسے تمام مخلوقات میں ممتاز کرتی ہیں اور جب یہ صلاحیتیں اللہ کی امانت سمجھ کر پورے شعور کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں تو مسلمانیت کا تشخص اور اس کی تہذیب قائم ہوتی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب مسلمان تحقیقی اور فکری کام میں پیش پیش تھے۔ مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ ہر شعبۂ زندگی میں زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کیں بلکہ ان معلومات کو اپنے نقطۂ نظر، طرزِ فکر اور عقیدے کے مطابق مرتب بھی کیا جس سے ایک ایسی غالب تہذیب وجود میں آئی جس کے رنگ میں دنیا رنگتی چلی گئی۔

مسلمانوں کے ایسے ہی کام کا اثر یہ تھا کہ صدیوں تک دنیا یہ سمجھتی رہی کہ اگر تہذیب ہے تو مسلمانوں کی، تمدن ہے تو مسلمانوں کا۔ توحید کو اس قوت سے پھیلایا کہ مشرکین بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ہم جانتے ہیں خدا تو ایک ہی ہے یہ دوسرے الٰہ تو محض اس کی شفاعت اور تقرب کا ذریعہ ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک وقت تھا کہ جب علوم وفنون میں تحقیق کا کام مسلمان کیا کرتے تھے اور دوسری قومیں ان کا پس خوردہ کھاتی تھیں۔ ان کے مرتب کردہ علوم سے استفادہ کرتی تھیں۔ اس کے بعد ایک دوسرا دور آیا جس میں مسلمانوں نے علم وتحقیق کا کام قریب قریب ترک کر دیا۔ جب علوم وفنون سے رشتہ ٹوٹا تو دو تین برس نہیں گزرے کہ جمود آنے لگا۔ مسلمان مغلوب ہونے لگے اور مغربی قومیں غالب آنے لگیں۔ اس جمود کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مغلوبیت کے اثرات ذہنوں پر چھاتے چلے گئے۔ اب خود مسلمانوں میں یہ بات اتر گئی کہ کوئی تہذیب ہے تو اہل مغرب کی، کوئی تمدن ہے تو مغرب کا، علم وفن سب کچھ اہل مغرب کا ہے اور ہمارا کام ان کے پیچھے چلنا ہے۔ مغلوب قوم کی انفرادیت ختم ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ فنا بھی ہو سکتی ہے اور جس قوم کا غلبہ ہوتا ہے وہ سیاسی اور معاشی حیثیت سے ہی غالب نہیں ہوتی بلکہ سب سے بڑھ کر اس کا غلبہ فکری حیثیت سے ہوتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے علوم و فنون کی بنیادیں اسلام کی فکری اساس پر اٹھانے کی اہمیت بتائی، یعنی جدید علوم کو اسلام کے نظام فکر وعمل کے مطابق مرتب کیا جائے۔ بلکہ سب سے پہلا کام ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ مغربی فکر اور مغربی فلسفہ کا جو سحر بندھا ہوا ہے اس کو توڑنے کا یہی طریقہ ہے جو علم وتحقیق کے راستے پر چل کر ہی سیکھا جا سکتا ہے یعنی دلیل کے ذریعے یہ بات ثابت کی جائے کہ مغربی علوم وفنون نے حقائق اور واقعات سے جو فلسفہ حیات بنایا ہے وہ قطعی باطل ہے۔ جو کائنات کے متعلق ان کا تصور اور انسان کے بارے میں تہذیب کی جو عمارت انہوں نے اٹھائی ہے، وہ محض فتنہ وفساد ہے جو انسانیت کی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

لہٰذا تنقید کے ساتھ ساتھ یہ تعمیری کام بھی ضروری ہے کہ تمام علوم کو اسلام کے نقطۂ نظر سے پیش کیا جائے تا کہ ہماری نسلیں اسلام کے برحق ہونے پر واقعی مطمئن ہو سکیں۔ ہم اپنے گھر میں بچے کو چاہے درست عقائد سکھا دیں لیکن درسگاہوں میں جب ان کے سامنے یہ صورت ہو کہ کسی مضمون میں خدا کا تصور ہی نہ ہو تو وہ کیسے جانیں گے کہ اس کائنات کے اندر کوئی خدا بھی ہے جب وہ سائنس پڑھ رہے ہوں یا علوم عمرانی تو ان کو کبھی یہ محسوس نہیں ہو گا کہ خدا کا بھی اس نظام میں کوئی حصہ ہے، رسولوں نے بھی کوئی فلسفہ و قانون دیا ہے۔ اس کے برعکس وہ تو یہی سوچ سکتے ہیں کہ معاذ اللہ اسلام نے سود کو بلا ضرورت حرام کر ڈالا جبکہ سارا معاشی نظام سود پر چل رہا ہے۔ چوری کی سزا ہو یا زنا کی معاذ اللہ کتنی ظالمانہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہی لوگ جب تعلیم پانے کے بعد ملک کا نظام چلانے کو آتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ اسلام زمانے میں چلنے والی چیز ہی نہیں ہے۔ انہوں نے سارے علوم جس انداز سے پڑھے ان سے تو یہی سمجھ میں آیا کہ مغربی نظام زندگی سے بہتر کوئی نظام نہیں کیونکہ ان کے سامنے ایک چیز چل رہی ہے اور دوسری معطل ہے۔ اس کا اثر ان علوم وفنون پر نہیں ہے جو انہوں نے پڑھے ہیں۔

ان حقائق کو دیکھنے اور جاننے کے بعد یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہن وقلم سے وہ کام کریں جو روئے زمین پر اسلامی تہذیب کے غلبہ کا باعث ہو اور آخرت میں رحمت ومغفرت ملنے کا سبب ہو۔☆

ناک...........!

ناک انسانی چہرے پر لگا تقریباً تین بائی پانچ سینٹی میٹر کا ایک معصوم سا عضو ہے جو دیکھنے میں انتہائی خوبصورت لگتا ہے بلکہ چہرے کی خوبصورتی کا دارومدار ہی ناک پر ہے، مگر بظاہر یہ بھولا بھالا سا عضو نہایت خوفناک ماضی اور مستقبل رکھتا ہے۔

اللہ کی پناہ! خود تو یہ کہیں نہیں جاتا مگر سارے کروز اور ٹام ہاک میزائل اسی کی وجہ سے ادھر سے ادھر جاتے ہیں، شہر ملبہ بنا دیئے جاتے ہیں، بچے یتیم کر دیئے جاتے ہیں اور عورتیں بیوہ، دونوں عظیم جنگوں کے پیچھے اس ماسی چلاکو کا ہاتھ تھا۔ یہ بھائی کو بھائی سے، شوہر کو بیوی سے ملنے نہیں دیتی، آدم علیہ السلام اور ابلیس سے لے کر ساس اور بہو کی لڑائی تک، ساری کارستانی اسی ناک کی ہے۔ جنوں کی ناک بھی انسانوں کی طرح تباہ کن ہوتی ہے بلکہ پہلی تباہ کاری ہی جن کی ناک نے کی تھی۔ اس ناک کو بے جان نہ سمجھا جائے بلکہ اس میں نفس کی جان ہوتی ہے، بندہ مر جائے کوئی بات نہیں بس ناک نہیں کٹنی چاہیے، کچہریاں ساری کی ساری ناک والوں سے بھری پڑی ہیں، جو ناک والوں نے دوسرے ناک والوں کی ناک کاٹنے کے لیے جھوٹے مقدمے بنا کر بھر رکھی ہیں!

میرے پاس جب بھی کوئی مسئلہ آتا ہے تو ساری بات مان لینے کے بعد کہتے ہیں کہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے مگر مسئلہ ناک کا ہے! اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم سر آنکھوں پر مگر اس ناک کو کہاں لے جائیں؟ آپ کی ساری باتیں سچ ہیں مگر اس ناک کا بھی تو کوئی حل کریں؟ میں نے عرض کیا جناب مجھے تو اس کا ایک ہی حل سمجھ آتا ہے کہ آئندہ بچوں کی ناک کا ختنہ کیا جائے تا کہ مسئلہ ہی حل ہو جائے، بلکہ اگر بڑے بھی تجدیدِ وضو کی طرح تجدیدِ ختنہ کر لیں تو سارے گھریلو اور سماجی مسائل حل ہو جائیں، بچیوں کے رشتے بھی ہو جائیں، جھوٹے مقدمے بھی ختم ہو جائیں اور مسئلہ کشمیر بھی حل ہو جائے کیونکہ ممالک میں بھی Face Saving کی اصطلاح اصل میں Nose Saving کے لیے آتی ہے، سیاسی جماعتوں کے رولے بھی ختم ہو جائیں بلکہ قادری صاحب اور کپتان خان کے انقلاب کا نقطہ آغاز ہی یہ ہونا چاہیے!

اس ناک میں اصلاً نفس کی جان ہے وہ اللہ کے احکام سے بچنے کے لیے اسی محفوظ قلعے میں پناہ لیتا ہے، اسے معلوم ہے کہ انسان سر کٹا دیتا ہے مگر ناک نہیں کٹنے دیتا، ایک صاحب جو نہ صرف دین دار تھے بلکہ دین کے ایکسپورٹر بھی تھے، جب ان کی بیٹی نے اسی نوجوان سے شادی کرنے پر اصرار کیا جس سے اس کی منگنی کر دی گئی تھی اور جو اس کے ماموں کا بیٹا بھی تھا، مگر اب ابا جی اس منگنی سے مکرنا چاہتے تھے تو انہوں نے اس حافظ قرآن بیٹی کو دو منزلہ مکان کی چھت سے سر کے بل گرا کر مار دیا اور انکشاف کیا کہ ''ان کے دین کا بیڑا تو غرق ہو گیا ہے مگر الحمدللہ! ناک بچ گئی ہے'' اس دن مجھے اس ناک کی قیمت کا اندازہ ہوا کہ یہ کعبے سے بھی زیادہ معزز ہے!

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت میں جانے کا چار نکاتی نسخہ بیان فرماتے ہیں،

صل من قطعک جو تجھ سے کٹے تو اس سے جُڑ، مگر یہ ناک جُڑنے نہیں دیتی۔

واعطِ من حرمک جو تجھے ضرورت کے وقت محروم رکھے اُسے ضرورت پڑے تو تو اسے دے، مگر یہ ناک دینے نہیں دیتی۔

واعف عن من ظلمک جو تجھ پہ زیادتی کرے تو اسے معاف کر

دے، مگر یہ ناک معاف بھی نہیں کرنے دیتی۔

واحسن الی من اسائک جو تیرے ساتھ برا کرے تو اس کے ساتھ اچھا کر مگر، یہ ناک کہتی ہے ''ہم آدمی ہیں تمہارے جیسے جو تم کرو گے وہ ہم کریں گے، گویا جنت کے آگے سب سے بڑا بیریئر یہی ناک ہے۔ اگر جنت میں جانا ہے تو جنت کی باؤنڈری صرف تیری ناک جتنی بلند ہے، اپنی ناک کو پھلانگ جا اور جنت میں داخل ہو جا، بالکل اسی طرح جس طرح کسی سے پوچھا گیا کہ جنت کا فاصلہ کتنا ہے؟ جواب ملا صرف دو قدم مگر شرط یہ ہے کہ پہلا قدم اپنے نفس پہ رکھو اگلا قدم جنت میں ہوگا! یہاں نفس سے مراد ناک ہی ہے!

ہم تو چاہتے ہیں کہ ہر گھر کے باہر ناک کی تصویر کا بڑا سا بورڈ لگا ہو، جس کو دو ہڈیوں سے کراس کیا گیا ہو اور لکھا ہو ''خطرہ'' اس گھر میں ناک رہتی ہے اندر داخل ہونے والا اپنے نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا!

اللہ پاک نے قرآن میں دو جگہ یہی بات سمجھائی ہے کہ کچھ لوگوں نے اصل میں تو ناک کو خدا بنا رکھا ہے، اور علم ہونے کے باوجود یہی ناک انہیں اللہ کے احکام پہ چلنے نہیں دیتی، نتیجے میں یہی ناک سماعت و بصارت اور قلب پر بھی گمراہی کی مہر لگوا دیتی ہے! اللہ کی حدوں سے نکل جانے والی ناک کو اللہ پاک نے سورۂ القلم میں 'خرطوم' یعنی سونڈ کہا ہے، پائپ کو بھی خرطوم کہا جاتا ہے اور یہ پائپ لائن بھی بن جاتی ہے جو کافی طویل ہو جاتی ہے، فرمایا ''سنسمہ علی الخرطوم'' ہم اس (ولید ابن مغیرہ) کی سونڈ پہ نشانہ لگائیں گے، صحابہ رضی اللہ عنہم کو بات کی سمجھ نہ آئی جب تک کہ بدر کے میدان میں تلوار کے وار کو ٹھیک ولید ابن مغیرہ کی ناک پہ نہ دیکھ لیا۔ تلوار نے اس کی ناک کے درمیان سے اس کے چہرے کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا!

بھائیو! سچ پوچھو تو ہم نے اس ناک کو مساجد کے منبروں پہ ناچتے دیکھا ہے جہاں یہ اپنے مخالف کی پیش کردہ آیت کو مانتی ہے نہ تفسیر نہ حدیث مانتی ہے نہ تشریح، اس کی نشانی یہ ہے کہ جونہی یہ مسجد میں داخل ہوتی ہے تو مومن اسی طرح پھٹ جاتے ہیں جس طرح دودھ میں کھٹی جاگ لگائی جائے تو دودھ پھٹ جاتا ہے۔ اس ناک کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ ''یہ ناک شکل بھی تبدیل کر لیتی ہے۔'' کبھی یہ کھیت اور کھلیان کا روپ دھار لیتی ہے، تو کبھی تاج اور تخت کا، کبھی یہ اکابر بن جاتی ہے تو کبھی مسلک و مشرب، میری ناک پکی پکی لگی ہوئی ہے، رات کو جہاں ہوتی ہے، صبح بھی وہیں ہوتی ہے الٹے لیٹو یا سیدھے، پہلو کے بل لیٹو یا بیٹھ کر سو جاؤ، ناک وہیں کی وہیں ہے، اس کو ناک کی استقامت کہا جاتا ہے!

اس ناک کا نام گل محمد ہے، آپ نے نہیں سنا؟ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔

اے میری ناک خدا تجھ کو سلامت رکھے!

(روزنامہ اسلام)

☆......☆......☆

آ گہی

سید فاطمہ گیلانی۔ساہیوال

ستمبر کے بتول میں پل صراط کے تحت ’’آ گہی‘‘ کے عنوان سے تحریر ہماری قوم کے لئے بے حد اہم ہے۔ یہ دو قوموں کی مسابقت کے لئے بہترین راہنمائی ہے۔ وہ دونوں جو عظیم قربانیوں کے بدلے میں بیک وقت ایک دوسرے سے اور ایک تیسری غاصب قوت سے آزاد ہوئیں لیکن ایک قوم نے اسی مدت سے اپنا آپ سنبھالنا شروع کیا جبکہ ہم نے سود پر قرضوں پر قرضے لینے شروع کر دیئے۔ جن کے بڑوں نے جان و مال حتیٰ کہ عزت کی بھی قربانیاں دے کر یہ مملکتِ خداداد حاصل کی تھی لیکن ان کی اولاد چند ٹکوں کے عوض دشمنوں کے ہاتھوں استعمال ہو کر اپنوں کو لوٹ رہی ہے۔ ہمارا دین ہمیں سکھاتا ہے کہ اچھے اصول دشمن کے پاس بھی ہیں تو وہ اپنالو جبکہ ہمارے بھارتی مسلمان جو ہمارے دینی بہن بھائی ہیں بہت سی خوبیاں رکھتے ہیں۔ کویت سعودیہ عرب امارات جہاں جہاں بھی وہ کام کر رہے ہیں اپنے ملک وقوم کا نام روشن کر رہے ہیں اپنے خلوص محنت اور قناعت پسندی کی بدولت۔ اس سلسلے میں دو تین بڑے دلچسپ واقعات میں آپ کو بتانا چاہوں گی۔

میری بڑی صاحبزادی سیدہ فردوس گیلانی جو دمام ہوتی ہیں، قرآن وحدیث کے حلقوں سے منسلک رہتی ہیں بتاتی ہیں کہ بھارت کی مسلمان بہنیں سادگی، قناعت پسندی اور محنت میں اپنی مثال آپ ہیں لیکن ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے میں پیش پیش۔ دینی کتب خریدنی ہوں تب بھی فیاضی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

کویت میں چھوٹے بھائی سعد حبیب اللہ بخاری ہیں۔ ان کا رابطہ بھی دنیا بھر کے اساتذہ وعلما سے خصوصاً انڈین لوگوں سے رہتا ہے۔ بھابھی کا بھی تعلیمی اور معاشرتی رابطہ ہے یعنی دعوت وضیافت افطاری میل جول کے اچھے معاملات، تو وہ بھی گواہی دے رہی تھیں کہ ان کے گھروں میں بہت سلجھاؤ، کفایت شعاری، فضولیات سے کنارہ کشی جیسی خوبیاں راج کرتی ہیں لیکن علم کے حصول کے لئے وقت بھی اور پیسہ بھی حاضر، یعنی علم وعمل کو اہمیت وفوقیت حاصل ہے۔ ان کی دعوتوں میں کوئی نمود ونمائش نام کی چیز نہیں۔ انسان کے جسم کو جتنی غذا کی ضرورت ہے اتنا ہی سب کے لئے، کوئی اونچ نیچ، افراتفری، دکھاوا نہیں۔ اطمینان قلب کے ساتھ رزق حلال میں سے مہمان نوازی اسراف کئے بغیر۔ مثلاً افطاری میں سالن اور فروٹ چاٹ کا ایک ایک ڈونگہ اور ایک ڈش چاول ہمارے پاکستانی حیران پریشان کہ یہ تو ہماری ایک ہی فیملی کی خوراک ہے لیکن کہتے ہیں، اتنی برکت اور اتنا مزہ کبھی ہمارے مرغن اور وافر کھانوں میں نہیں آیا۔ ہمارے ساہیوال گرلز کالج کی لیکچرار بسمل صابری جو شاعرانہ ذوق رکھتی ہیں۔ موصوفہ صبح کی سیر کرتے ہوئے مل گئیں ملکی حالات پر گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ ہمارے مدمقابل انڈیا نے کس طرح تیزی کے ساتھ ترقی کے زینے طے کئے ہیں۔ بتانے لگیں ان کے کھانے میں بھی توازن اور اعتدال ہے۔ سب کو ایک جیسا یعنی صرف دو دو چپاتیوں کا پابند کرنا۔ کہنے لگیں کہ ہم کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے وفد کی صورت میں دہلی گئے۔ ضمیر جعفری بھی ساتھ تھے، تو گھبرا گئے کہ ان چھوٹی چھوٹی دو روٹیوں کے ساتھ تو میری داڑھ بھی گیلی نہیں ہوئی۔ اسی طرح جب ٹرین پر سفر کا مرحلہ آیا واپسی کے دوران تو جواب ملا سیٹ نہیں ہے۔ ہم پریشان منت سماجت پر اتر آئے کہ ہم بچے چھوڑ کر

آئے ہیں، ہمارے ویزے کی تاریخ ختم ہو جائے گی۔ تب کہیں انہوں نے ہمیں ڈاک کے ڈبے میں جگہ بنوا کر دی۔

اللہ کرے ہماری قوم ان کی فلموں اور ڈراموں سے متاثر ہونے کے بجائے ان کے اچھے اصولوں سے متاثر ہو کر اپنی فضول خرچی اور نمود و نمائش چھوڑ دے۔

☆......☆......☆

میرے ابّو

سیدہ حفصہ افضل۔ لاہور

میرے ابو (محمد افضل ہاشمی) کی وفات 16 نومبر 2014ء کو ٹھیک اڑھائی بجے تہجد کے وقت ہوئی۔ اس دن صبح دو بجے (دوپہر کے وقت) ابو نے ایک ریلی کی قیادت کرنی تھی۔ ان کا جنازہ ٹھیک دو بجے اٹھا اور ابو نے ریلی کی قیادت کی مگر کسی اور شکل میں! ابو اپنی جوانی کے دور میں جمعیت کے رکن رہے اور اپنے علاقے کے ناظم بھی۔ اللہ کے راستے میں ابو نے ماریں بھی کھائیں جیلیں بھی کاٹیں۔ جماعت اسلامی میں شمولیت کے بعد انہوں نے اپنے عہد کو وفا کیا آخر دم تک۔ ابو کا حلقہ رفاقت بہت وسیع تھا۔ جماعت کی طرف سے الیکشن بھی لڑتے رہے اور علاقے کے نائب ناظم بھی رہے۔

جب سڑکیں بنانی تھیں تو ٹھیکیدار ابو کے پاس آیا کہنے لگا 'ہاشمی صاحب! سڑکوں کو چھوڑیں ہم دونوں فنڈ آدھا آدھا کر لیتے ہیں' تمام لوگوں نے ایسے ہی کیا ابو سے پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا اور ابو کے بعد بھی۔ ابو نے کہا 'ٹھیک ہے مگر میری ایک شرط ہے' ٹھیکیدار کہنے لگا 'آپ بتائیں مجھے منظور ہے' ابو کہنے لگے 'تم بس قبر میں میری طرف سے اللہ کو جواب دے دینا' ٹھیکیدار گڑبڑا گیا۔ مجھے فخر ہے ابو پر اور جماعت اسلامی کا کارکن ہونے پر۔ تمام علاقے کی سڑکیں ابو نے بنوائیں۔ ان کے تعلقات ہر کسی سے بہترین تھے حتیٰ کہ گلی کے جمعدار سے بھی۔ ان کی وفات پر گلی کے جمعدار بھی رو رہے تھے، میرے ابو اور امی دونوں کا رجحان ادب اور مطالعہ کی طرف بہت ہے جو کہ وراثت کے طور پر ہمیں نصیب ہوا۔ ابو کی وفات پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ کوئی یقین نہیں کر رہا تھا کہ ابھی رات کو تو ملے تھے بالکل ٹھیک اب اس دنیا میں نہیں ہیں

تیری لحد پر خدا کی رحمت، تیری لحد کو سلام پہنچے
مگر تیری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقین نہیں ہے!

☆......☆......☆

کیا یہ تفریح ہے؟

عمیرا علیم

پچھلے دنوں دورانِ سفر بس میں ہمسایہ ملک کی فلم تفریح کے نام پر دکھائی جا رہی تھی۔ جس کے فحش اور بے ہودہ ڈائیلاگز نے نظریں اُٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ میں اپنے والد صاحب کے ساتھ بیٹھی شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ پیچھے بیٹھے مسافروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ''واہ واہ! کیا فلم ہے۔ گنجے شوہر نے شادی کی رات کیا خوب ''اداکاری'' کی ہے۔ مزہ آ گیا۔''

ایسی گھٹیا فلمیں بنانے والے اور دکھانے والے یہ نہیں سوچتے کہ اس کے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ عورت کو تفریح کا سامان بنا دیا گیا ہے۔ بغیر شادی کے لڑکیوں کو حاملہ بنتے دکھایا جاتا ہے۔ کوئی اشتہار عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ مختصر لباس جو مختصر ہوتے اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ بل بورڈ پر لگے اشتہارات نظریں جھکا دیتے ہیں۔ یہ سب عورت کی عزت کو کم کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ حوا کی بیٹی تفریح کا سامان نہیں ہے۔ قرآن بدی اور بے حیائی سے روکتا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھا جائے تاکہ ہمارے عمل میں تبدیلی آئے۔

☆......☆......☆

محشرِ خیال

رفعت اعجاز۔لاہور

ماہنامہ بتول ایک ایسا بہترین رسالہ ہے جو خود بولتا ہے،''میں منفرد ہوں'' کیونکہ یہ بلا مبالغہ علمی ادبی اور اصلاحی جریدہ ہے۔ایسے رسائل فی زمانہ معاشرے کے ہر فرد کی ضرورت ہیں۔مثبت کرداروں کو اس طرح سے اجاگر کرنا کہ ہر پڑھنے والے کے دل و دماغ میں اتر جائیں یہی تو کمال ہے۔لکھنے والے تو بہت ہیں لیکن ان کا چناؤ عملہ ادارت کا کام ہے جو بڑے احسن طریقے سے کیا جاتا ہے۔اس لئے جتنے قابلِ ستائش لکھنے والے ہیں اتنے ہی قابلِ ستائش منتظمین ہیں۔جوہر شناس ہی جوہر کو منتخب کرسکتا ہے۔یہ رائے صرف میری ہی نہیں بلکہ یہ رسالہ میرے اردگرد جتنے بھی لوگوں کے زیرِ مطالعہ ہے ان سب نے ایسے ہی الفاظ میں ''بتول'' پر تبصرہ کیا ہے اور اس کو سنبھال کر رکھنے کی خواہش ظاہر کی کہ ہماری نسلیں ایسے جرائد کی محتاج ہیں۔قرآن و حدیث کا پیغام اس قدر سہل اور عام فہم انداز میں دیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتا ہے۔ہمارے بچے ہر نئی ایجاد کو غلط انداز میں استعمال کرنے کے عادی ہو رہے ہیں۔''بتول'' ان کی اصلاح میں بے حد کارآمد اور پُراثر ثابت ہو رہا ہے۔اکثر ماؤں کو میں نے کہتے سنا ہے یہ رسالہ میں نے اپنی بچیوں کے لئے محفوظ کر لیا ہے اور ان کو پڑھنے کی ترغیب بھی دے رہی ہوں۔ام ایمان کا افسانہ''بے خبری'' ہر ماں کو آنکھیں کھولنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ام فاطمہ کی تحریر''آ گہی'' میں خوبصورتی سے بچوں کو میڈیا کے غلط اثرات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ادب،صحافت اور میڈیا،معاشرے کو بگاڑنے یا سنوارنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہیں۔میری دعا ہے اللہ اس خوبصورت رسالے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔(آمین)

☆......☆......☆

رخسانہ کوثر۔وہاڑی

بتول کی پوری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے جو اتنی محنت سے روشنی پھیلا رہی ہے۔اللہ تعالیٰ آپ سب کی کوششوں کو قبول فرمائے۔تمام لکھاری بہنوں کو اللہ رب العزت جزائے خیر عطا فرمائے اور وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اس کشت کی آبیاری کرتی رہیں۔آمین۔ایک تو بتول بہت تاخیر سے ملتا ہے ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے فہرست میں باجی شاہدہ اکرام اور قانتہ رابعہ کے نام تلاش کرتی ہوں۔گوشۂ تسنیم پر نظر دوڑا کر اپنا محاسبہ کرتی ہوں۔

کتب کا تعارف ایک بہت اچھا اور دلچسپ سلسلہ ہے جس سے کتابوں کے بارے میں آگاہی ہو جاتی ہے اور پڑھنے کے شوقین قاری تجسس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔(میری طرح)۔جون 2015ء کے شمارے میں شاہدہ اکرام کے مہکتے آنگن نے یادوں کے دیپ جلا دیئے۔وہ پیار،محبت،اتفاق و اتحاد،رشتوں کی مٹھاس،ایک دوسرے کا دکھ درد محسوس کرنے والے دل آہستہ آہستہ تیز رفتار زندگی کی اور اس کی چکا چوند میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔خاندانی اقدار اور روایات تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ہمیں اپنی نسل کو ان روایات کا امین بنانا ہے۔اپنے عمل سے ایثار و قربانی،باہمی یگانگت اور سچی محبت کا درس دینا ہے۔انشاءاللہ

دانش یار نے 'کھجور' کے بارے میں نادر اسلامی،تاریخی اور طبی معلومات کا ذخیرہ پہنچایا۔کھجور کے فوائد و اوصاف سے مزید آگہی ہوئی۔قانتہ رابعہ کی تحریر''زبان پر قابو'' بہت فکر انگیز ہے۔واقعی زبان کی پھسلن انسان کو اللہ کی نظر میں کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے اور کسی بندے کے دل پر کتنے زخم لگا دیتی ہے جو مندمل بھی نہیں ہو سکتے۔

قرآن و حدیث کے حوالے سے''امانت'' کے بارے میں مضمون بہت اہم ہے۔ہمارے پاس جو امانتیں ہیں ان کا حساب ہم اللہ کو کیسے دیں گے اللہ ہم سب کو صحیح طریقے سے''امانت'' کا حق ادا کرنے والا بنائے۔آمین۔

ڈاکٹر فلزہ آفاق نے بڑی اہم توجہ دلائی کہ بتول کو ناواقف لوگوں تک پہنچا کر اپنے لئے صدقہ جاریہ بنائیں۔اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں بتول کو بھیجیں کیا پتہ کسی کا مشاہدہ،تجربہ یا بات ہمارے لئے تحرک کا باعث بن جائے۔☆

خواب اور خیال

خواب اور خیال میں وہی فرق ہے جو دن اور رات کا ہے۔خواب رات کے ساتھ (عموماً) وابستہ ہوتے ہیں کہ رات کے ساتھ نیند کا استعارہ لازم ہے۔نیند کا مطلب ہے وقت کی قید سے آزاد ہو جانا۔ہر وقت انسان کا دماغ مصروف رہتا ہے اور دماغ کی یہ مصروفیت دو طرح کی ہے۔ایک مصروفیت یہ ہے کہ بیداری میں ہمہ وقت انسان کے دماغ کی مشین چلتی رہتی ہے۔کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا جب دماغ میں خیالات کی گردش نہ ہو۔اور یہ گردش دوسری صورت یعنی سوتے وقت بھی جاری رہتی ہے۔البتہ بیداری کی حالت میں آدمی خود کو پابند محسوس کرتا ہے اور وقت ماحول، سماعت و بصارت کا پابند ہونا اس کی مجبوری ہے۔انسان بیداری میں اپنے ماحول، وقت و دیگر مجبوریوں کا پابند ہونے کی وجہ سے ایک گھنٹے میں کوئی متعین فاصلہ ہی طے کر سکتا ہے۔مگر عالم خواب میں یہ پابندی نہیں ہوتی اور وہ لاکھوں میل کا سفر بلکہ کائنات کے دیگر سیاروں تک بغیر کسی سواری کے وقت کے تعین کے بغیر پہنچ جاتا ہے۔یہ دماغ کی دوسری مصروفیت ہے اور اس میں ظاہری سماعت و بصارت کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

نیند موت کی ''چھوٹی بہن'' سمجھی جاتی ہے گویا ظاہری زندگی سے ناطہ ٹوٹ جانے یا موت کا ایک تجربہ ہے۔خواب ارادے اور اپنی خواہش سے نہیں دیکھے جا سکتے انسان نہیں جانتا کہ جب وہ سوئے گا تو وقت کی قید سے نکل کر کس دنیا کی سیر کرے گا اور کہاں سے کہاں جا پہنچے گا۔انسان عالم غیب یا لاشعور میں جا پہنچتا ہے تو کیفیات لطیف ہو جاتی ہیں۔زمان و مکان کی پابندی کا تعلق عالم ظاہر سے یا شعوری زندگی سے ہے۔لاشعور کی زندگی شعوری زندگی کی طرح محدود اور بوجھل نہیں ہوتی۔

قرآن پاک میں جتنے قصے بیان کئے گئے ہیں ان میں ''احسن القصص'' سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے جس کی بنیاد ایک خواب ہے۔اس خواب پہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنا خیال (تعبیر) ظاہر کیا۔قید خانے میں سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے ساتھی قیدیوں کے خواب پہ اپنا خیال (تعبیر) ظاہر کیا اور دونوں قیدیوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے خیال (تعبیر) کو سچا پایا، اور سیدنا یعقوب علیہ السلام کے خیال کو ایک دنیا نے کچھ مدت گزرنے پر حقیقت کے روپ میں دیکھا۔خواب ایک اشارہ ہے کسی ایک خیال پہ اپنی زندگی کے رُخ کو متعین کرنے کا۔معاملات کو درست سمت پہ لے جانے کا۔یا کسی غلط رُخ سے ہٹ جانے کا۔یہ بھی یا تو ''خوشخبری'' ہے یا پھر (انذار) ''ہوشیار باش'' کا اشارہ ہے۔

انسان خواب دیکھتا ہے تو تنہا ہوتا ہے۔خوابیدہ شخص جو دیکھتا ہے اس کے متعلق پہلو میں لیٹا فرد بھی نہیں جانتا وہ کہاں ہے اور کیا دیکھ رہا ہے وہ ساتھ ہوتے ہوئے بھی اس کے سفر میں شریک نہیں ہوتا لیکن خواب سنانے اور اس کی تعبیر کے لئے دنیا کے لوگ درکار ہوتے ہیں۔انسان اکیلا خواب دیکھ سکتا ہے، اس کی تعبیر اکیلے حاصل نہیں کر سکتا۔گویا کہ خواب کا تعلق غیب سے ہے اور خیال کا تعلق ظاہر سے ہے۔غیب آخرت ہے، ظاہر دنیا ہے۔دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہونا توازن اور اعتدال کے ساتھ کامیابی کی ضمانت ہے۔خواب کسی کامیابی تک اسی صورت میں لے جا سکتے ہیں جب ظاہری (دنیا) کے گرم و سرد سے نبرد آزما ہوا جائے۔جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر تک پہنچنے کے لئے کتنے نشیب و فراز کا سامنا کرنا پڑا۔خواب کی تعبیر کے

بارے میں کوئی ماہر ہی رائے دے سکتا ہے اور یہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کیا گیا علم ہے۔خوابوں کے بارے میں کوئی حتمی توجیہہ ابھی تک کوئی نہیں دے سکا۔ یہ اللہ رب العزت کے ان معاملات سے ہے جہاں انسان کا علم بے بس ہے۔وہ ہی جس کو چاہے اپنے علم کے خزانے سے عطا کر دے۔اپنی اپنی ذہنیت،علم اور استعداد کے مطابق ہر قوم کے لوگوں نے خیال آرائیاں کی ہیں۔لیکن نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ فرما دیا کہ نبوت ختم ہوگئی،وحی کا سلسلہ بند ہو گیا البتہ سچے خواب نبوت کا چھیالسواں حصہ ہوں گے تو پھر یہی یقین ہے کہ یہ معاملہ خالص اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ ہے۔وہ جس کو چاہے اپنے فضل سے نواز دے۔

نیند چھوٹی موت ہے جو انسان کو بستر پہ آتی ہے اور پھر چند گھنٹے بعد وہ زندہ ہو جاتا ہے۔گویا روزانہ ’’زندگی بعد موت‘‘ کا تجربہ ہے۔

انسان کی قبر وہ بستر ہے جہاں ’’لمبی نیند‘‘ کا تجربہ ہوگا اور پھر حشر کی ’’صبح‘‘ اس کو جگا دیا جائے گا۔اس درمیانی عرصہ میں وہ کن خواب و خیال میں مگن رہے گا؟ سچی بات ہے انسان کے افکار و اعمال،معمولات، خورد و نوش کے اثرات اس کے خوابوں پہ ضرور پڑتے ہیں۔اسی طرح وہ اپنی زندگی کے افکار و عمل کے مطابق جنت یا دوزخ کے مشاہدے (خواب) میں مصروف رہے گا۔جس طرح دنیا میں سوتے وقت دماغ مصروف رہتا ہے، ماضی و مستقبل کے نظارے کرتا ہے ہر قسم کی مجبوری سے آزاد ہو کر اسی طرح ’’قبر کے بستر‘‘ پہ ’’لمبی نیند‘‘ کے دوران وہ اپنے ’’کارناموں‘‘ کو دہراتا رہے گا اور ’’مستقبل‘‘ کی جھلک دیکھتا رہے گا۔ جس طرح پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے دو افراد ایک دوسرے کے خواب میں شریک نہیں ہوتے اسی طرح قبروں کا قرب بے شک جتنا بھی زیادہ ہو، سب نے حشر کی ’’صبح‘‘ ہونے تک اپنی اپنی جنت یا دوزخ کے ’’خواب‘‘ دیکھنے ہوں گے۔

☆......☆......☆